ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

۱۹/ اگست ۹۶ء

☆ ہم نے مغربی پاکستان کو ہی پورا پاکستان سمجھ لیا ہے !

☆ یہ ملک مٹھی بھر مفاد پرستوں کی عیاشیوں کے لئے نہیں بنا تھا

☆ مہابھارت کی جنگ مغربی عراق میں اربیلا کے میدان میں ہوئی

حدیث امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

مغرب کی یلغار

پاکستان میں آج کل ہر کوئی رو رہا ہے۔ حزب اقتدار ہو یا حزب اختلاف' امیر ہو یا غریب' مرد ہو یا عورت' سبھی رو رہے ہیں۔ حزب اقتدار کا رونا ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور اسے سکون سے کار حکومت چلانے نہیں دیتے جبکہ حزب اختلاف کا رونا ہے کہ اتنے جتن کرنے کے بعد بھی حکومت سے خلاصی نہیں ہوئی۔ امیر کا رونا ہے کہ غریب کی آنکھ میں گستاخی جھلکنے لگی ہے جبکہ غریب کا رونا ہے کہ اسے پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی نصیب نہیں۔ مرد کا رونا ہے کہ عورت آزاد ہو کر ہاتھ سے نکلے جا رہی ہے جبکہ عورت کا رونا ہے کہ مرد اسے غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ البتہ اس تمام رونے میں ایک سر یکساں ہے اور وہ یہ کہ مغرب نے ہم پر یلغار شروع کر رکھی ہے۔ دین نما اکابرین اسے ثقافتی یلغار کہتے ہیں کہ ہمارے خاندانی نظام کو تباہ کرنے کی سازش ہے' خواتین کو آزادی کا سبق دیا جا رہا ہے اور ماہرین سیاست اسے اقتصادی یلغار کا نام دیتے ہیں کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے ہمیں مفلوج کر دینے کا عزم کر رکھا ہے۔ اس صورتحال کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ تاویلی مباحثہ مقصود ہو تو ہر انداز چل جاتا ہے لیکن اصلاح احوال سنجیدہ اور غیر جانبدارانہ غور و فکر کئے بغیر ممکن نہیں۔ تو آیئے فریقین کے تمدن کا تقابلی جائزہ لیں کہ کون کسے دے یا لے رہا ہے۔ مغربی تہذیب کی اساس جمہوریت ہے جس میں مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ ہونے کے ناطے کوئی عمل دخل نہیں مگر ہم نے تو انگریز اور ہندو سے اسلام کے نام پر آزادی کا مطالبہ کیا تھا تو پھر ہمارا طرز عمل دین کی روح سے آج تک عملاً کیوں عاری ہے؟ ہمارا ایک قانون بھی قرآن و سنہ کے مطابق نافذ العمل نہیں۔ شریعت کورٹ بنی تو نام کی' اور اگر اس نے ایک فیصلہ سود کے بارے میں قرآن کی نص قطعی کے مطابق دے ہی دیا تو اس وقت کے وزیر اعظم نے جو آج بھی دیندار کہلاتے ہیں اور جن کی قیادت میں دینی جماعتیں کام کرنا باعث فخر سمجھتی ہیں اس فیصلے کے خلاف اپیل کر دی۔ مغرب میں مذہب کی مکمل آزادی ہے۔ جس شوق و جذبہ سے ہمارے دینی رہنما برطانیہ' امریکہ فرانس وغیرہ جا کر کھلے بندوں مذہب کا پرچار کرتے ہیں اور عطیات قبول فرماتے ہیں اور جس طرح جناب احمد دیدات نے عیسائی ممالک میں رہتے ہوئے عیسائیت کے بخئے ادھیڑے ہیں اس کا عشر عشیر بھی عیسائی مشنری پاکستان میں کام کرتے تو ہم بلبلا اٹھتے۔ ہمارے ہاں تو غیر مسلک کو برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ غیر مسلک کو قتل کرنا کار ثواب شمار ہوتا ہے۔ غور طلب ہے یہ بات کہ ہمیں دیکھا دیکھی یا ہماری تعلیمات کی بدولت کتنے عیسائیوں نے پاکستان میں اسلام قبول کیا؟ مغرب سے حقوق انسانی کا مطالبہ شد و مد سے دہرایا جاتا ہے جسے ہم یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ اسلام میں انسانی حقوق کا معیار کہیں بلند ہے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ مغرب میں ہر بے روزگار کو معقول گزارہ الاؤنس (income support) ملتا ہے جبکہ ہمارے ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں بھیک منگتے شرف انسانیت کا منہ چڑا رہے ہیں۔ وہاں ۶۵ سال کی عمر کو پہنچنے والے ہر شخص کو پنشن ملتی ہے اور بزرگ شہری (senior citizen) کا سلوک' ہمارے ہاں کتنے بوڑھے بدسلوکی کی بنا پر موت کی تمنا لئے زندگی کے پہر گزارتے ہیں۔ مغرب نے عورت کو مکمل آزادی دے کر اسے ذلیل کر دیا' ہمارے ہاں عورت مغرب کی تقلید میں نہیں قید و غلامی سے اکتا کر آزادی چاہ رہی ہے۔ اسلام کا لبادہ اوڑھے دین کا سبق دینے والوں سے کوئی پوچھے آپ میں سے خود کتنے اپنی بیٹیوں کو وراثت میں پورا حق دیتے ہیں؟ شرم و غیرت کے مارے بہنوں بیٹیوں کو بدکاری کے الزام میں قتل کر دینے کی خبریں تو روزانہ منظر عام پر آتی ہیں لیکن بدکار مردوں کا سر پھوڑنا تو کجا انہیں عدالتوں سے بھی کبھی کماحقہ' سزا ملنے کی اطلاع نہیں ملتی۔ کیا سعودی عرب میں زانی کا سر قلم کر دینا غیر اسلامی فعل ہے؟ مغرب کی جانب سے اقتصادی یلغار

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت : ۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الہدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور محتاج اور مسافر کو اس کا حق 'اور بے جا مت اڑاؤ O

(والدین کے حق کے مفصل بیان کے بعد.....جو پچھلے سبق میں ہم پڑھ آئے ہیں.....اب دیگر حقوق العباد کا ذکر ہے کہ اگر اللہ نے تمہیں مال واسباب دنیوی کی فراوانی عطافرمائی ہے تو جان لو کہ تمہارے مال میں اللہ نے غریب رشتہ داروں ' مساکین و فقراء اور مسافروں کا حق رکھ دیا ہے ' جو تمہیں ادا کرنا ہے ' کہ تمدن و معاشرت کی صحت کا دارومدار اسی اہم اصول پر ہے کہ صاحب ثروت افراد اور غرباء کے مابین خلیج وسیع نہ ہونے پائے اور کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی کے حصول سے محروم نہ رہے.....اور سختی سے تاکید کردی گئی کہ تبذیر سے بہر صورت گریز کرو کہ بلا ضرورت اگر پیسہ بہایا جارہا ہو اور محض نام و نمود کے لئے لاکھوں اڑائے جارہے ہوں کہ یہ چیز معاشرے کو طبقات میں تقسیم کرنے اور غرباء کے دلوں میں امیروں کے خلاف نفرت و دشمنی کے جذبات کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے)

بلا شبہ بے جا دولت اڑانے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے O

(لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بونا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد پیدا کرنا ہی تو شیطان کا سب سے موثر ہتھیار ہے ' تو محض نام و نمود کی خاطر روپے پیسے کو پانی کی طرح بہانے والے در حقیقت شیاطین کے آلہ کار ہیں ' جو لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت ' احترام اور مودت ورحمت کے جذبات کو فروغ دینے کی بجائے دلوں کو پھاڑنے اور نفرت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کا باعث بنتے ہیں)

اگر ان سے تمہیں اغراض کرنا پڑجائے ' اس بنا پر کہ ابھی تم خود اپنے پروردگار کی اس رحمت کے انتظار میں ہو جس کے تم امیدوار ہو ' تو ان سے بات کرو نرم انداز میں O

(کہ وہ شخص جس کا دروازہ غرباء اور سائلین کے لئے ہر وقت کھلا رہتا ہو ' اگر کسی وقت خود تنگی کی حالت میں ہو اور اللہ کے فضل کا متلاشی ہو اور اس حالت میں کوئی سائل اس کے دروازے پر دستک دے تو اگرچہ اس کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو ' تب بھی سائل کو سختی سے جواب دینا اور جھڑکنا کسی طور پسندیدہ نہیں ' بلکہ نرم لہجے میں ان کو جواب دینا اور معذرت کرنا ہی صحیح طرز عمل ہو گا کہ رب کائنات نے یہی تلقین فرمایا ہے)

(سورۃ بنی اسرائیل ' آیات ۲۶ تا ۲۸)

جوامع الکلم

یقیناً تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق شامل ہے

(کہ محض زکوٰۃ دے کر مطمئن ہو جانا کہ میرے مال میں رشتہ داروں ' ضرورت مندوں ' محتاجوں اور سائلین کا جو حق تھا ادا ہو گیا ' خام خیالی ہے۔ اگر کسی کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی وافر مال موجود ہو اور اس کے رشتہ داروں میں کوئی ضرورت مند اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے بھی تہی دست ہو ' یا اس کے پڑوس میں محتاج و مساکین موجود ہوں اور وہ ان کی ضروریات کا خیال نہ کرے یا کسی سائل کو دھتکار دے تو ازروئے فرمان نبوی روز قیامت اس سے بازپرس ہو گی اور وہ حقوق العباد میں کوتاہی کا مجرم گردانا جائے گا)

(الحدیث)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۳۲

۱۹/ اگست ۹۶ء

17

ایڈیٹر
حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات
تحریک خلافت پاکستان
۴ - اے، مزنگ روڈ، لاہور

○

مقام اشاعت
۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون : ۳-۵۸۶۹۵۰۱

○

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ لاہور

○

قیمت فی پرچہ : ۸ روپے
سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زر تعاون برائے بیرون پاکستان
☆ ترکی، اومان، مصر ۱۴/امریکی ڈالر
☆ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان ۲۰ امریکی ڈالر
☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

آئندہ سال ۱۴/ اگست کا سورج طلوع ہونے پر شمسی تقویم کے لحاظ سے پاکستان کو معرض وجود میں آئے پچاس برس مکمل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اگلا سال پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی تقریبات منانے کا سال قرار پایا ہے۔ ہم نے قومی سطح پر اپنی "بیدار مغزی اور شعور کی پختگی" کا ثبوت دیتے ہوئے ابھی سے گولڈن جوبلی منانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اس کی تمہید کے طور پر امسال بھی یوم آزادی کو سرکاری سطح پر زیادہ جوش و خروش سے منانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ گویا قوم کو کھلونے دے کر بہلانے کی تیاریاں مکمل کر لی گئی ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ ۹۷ء کا پورا سال گولڈن جوبلی تقریبات کے حوالے سے گانے بجانے، رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرنے اور نت نئے انداز سے جشن منانے میں گزرے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمران اگر "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے نشے میں سرشار و سرمست نظر آتے ہیں تو ہمارے عوام "وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا، کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا" کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہیں۔ گویا بحیثیت مجموعی حالات نہایت حوصلہ شکن ہیں۔ تاہم ان معدودے چند لوگوں کے لئے جو مایوسی کے ان اندھیاروں میں بھی امید کا دامن تھامے ماحول سے برسرپیکار ہیں اور اس مملکت خداداد پاکستان کو اسلام کا حقیقی گہوارہ بنانے کے لئے مقدور بھر کوشش کئے چلے جا رہے ہیں، امید کی بعض کرنیں وقتاً فوقتاً نمودار ہو کر ان کی ہمت بندھاتی رہتی ہیں۔ ایک بندۂ مومن کے لئے صحیح طرز عمل بھی یہی ہے کہ اللہ نے جو ہمت و استطاعت اور توفیق اسے دی ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے اپنا فرض ادا کئے چلا جائے اور جہاں بھی امید و روشنی کی کوئی کرن اسے نظر آئے اسے غنیمت جانتے ہوئے اس سے اپنے عزم اور حوصلہ کی مدھم ہوتی آنچ کو تیز کرنے کا سامان کرتا رہے۔

امید کی ایک تازہ کرن عدلیہ کے ایوانوں سے چمکی ہے۔ اور گذشتہ کچھ عرصہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عدلیہ کے وقار کی بحالی کا عمل کسی نہ کسی درجے میں شروع ہو چکا ہے۔ اگر عدلیہ ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تو یہ ملک کے لئے ایک نہایت خوش آئند بات ہو گی۔ اس ضمن میں امید کرنی چاہئے اور ہماری دعا بھی یہی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے درمیان حالیہ کشمکش کسی رکاوٹ کا باعث بننے کی بجائے عدالتی نظام میں بہتری کا موجب ثابت ہو۔ اگر کوئی قانونی سقم فی الواقع موجود ہے تو اس کی اصلاح کر کے اس نظام کو قابل عمل بنایا جانا چاہئے۔

کرپشن کا زہر گو ہمارے پورے جسد ملی میں سرایت کر چکا ہے اور کم و بیش ہر شخص خواہ اس کا تعلق حکمران طبقے سے ہو یا حزب اختلاف سے اور وہ عوام میں سے ہو یا خواص سے اس کا تعلق ہو، بقدر ہمت و استطاعت اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہا ہے۔ تاہم یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ حکمران طبقے کی بے پناہ اور بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ اور من مانی کارروائیوں نے عوام کو مستقبل کے بارے یکسر مایوس اور بددل کر دیا ہے۔ اس کی تلافی کا کسی قدر سامان اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ بلا رُو رعایت مجرموں کو عبرتناک سزا دی جائے۔ عوام کا سیاسی اور معاشی استحصال کرنے والوں اور قوم کو معاشی بدحالی کی انتہا تک پہنچانے کے ذمہ دار افراد کو عدالتی کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے۔ اس ضمن میں سب سے اہم ذمہ داری طبقہ وکلاء اور ماہرین قانون پر عائد ہوتی ہے۔ انہیں ذاتی مفادات اور گروہی تعصبات کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر اپنا کردار ادا کرنا اور قوم کو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں سے نکالنے کے لئے روشنی کا مینار بننا ہو گا۔ ان اقوام کی جانب سے بھی، جنہیں ہم کافر و مشرک گردانتے ہیں، جذبہ حب الوطنی کی قابل قدر مثالیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، تو آخر توحید کے ماننے والے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے پر فخر کرنے والے ایسی مثالیں پیش کرنے سے کیوں قاصر ہو گئے ہیں! اس کے ساتھ ہی جو سیاسی اور سماجی تنظیمیں اصلاح احوال کے لئے کوشاں ہیں انہیں بھی چاہئے کہ عدلیہ کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اپنی مدد اور تعاون فراہم کریں۔ خصوصاً وہ حلقے جو اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں انہیں لازماً آگے آنا چاہئے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے کھویا بہت کچھ ہے اور پایا بہت ہی کم ہے۔ حصول آزادی کے پچاس برس بعد اب بھی اگر ہم عدلیہ کے وقار کی بحالی اور استحصال کرنے والے طبقات کو قرار واقعی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بھی یقیناً ایک مثبت پیش رفت ہو گی۔ OO

آر ایس ایس کا ہدف اسلام اور پاکستان کا خاتمہ ہے

آزادی کے حصول کے باوجود دنیا کے کسی ایک مسلمان ملک میں بھی اسلامی نظام قائم نہیں ہوا !

ہم ایک بار پھر عذاب کے مستحق بن چکے ہیں، تاریخ سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا

ڈاکٹر اسرار احمد

اب ہم اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں امت مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس امت پر بھی بعینہ عروج و زوال کے وہی چار دور آچکے ہیں جو تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کئے گئے ہیں۔ امت مسلمہ کا پہلا دور عروج عربوں کی زیر قیادت آیا۔ اس پہلے دور میں خلافت راشدہ کا سنہری دور بھی شامل ہے۔ اس کے بعد خلافت راشدہ ختم ہو گئی مگر مسلمانوں کی حکومت موجود رہی۔ اس کے بعد پہلا دور زوال صلیبیوں کے ہاتھوں آیا۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم ہاتھ سے نکل گیا اور لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ اس کے بعد ۱۲۵۸ء میں وہ فتنہ تاتار آیا جس میں کروڑوں مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ ان کی عظیم مملکت تہس نہس کر دی گئی---- ۱۲۵۸ء میں بغداد کا سقوط ہوا۔ بنو عباس کے آخری خلیفہ کو محل کے اندر سے گھسیٹ کر نکالا گیا گیا اور جانوروں کی کھال میں لپیٹ کر گھوڑوں کے سموں تلے کچلوا دیا گیا۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے مرثیہ کہا تھا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

(امیر المومنین مستعصم کی بادشاہت کے زوال پر آسمان کو حق ہے
کہ وہ زمین پر (خون کے) آنسو برسائے)

دیکھئے دونوں امتوں کی تاریخ میں کتنی گہری مشابہت ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاربن کاپی ہو۔ وہاں پہلے شمال سے آشوری آئے تھے جبکہ یہاں پہلے یورپ یعنی شمال سے صلیبی آئے۔ وہاں مشرق سے کلدانی آئے تھے جبکہ یہاں مشرق سے تاتاری آئے۔ وہاں لاکھوں انسانوں کا خون بہا، یہاں کروڑوں انسان تہ تیغ ہوئے (موجودہ امت مسلمہ کی وسعت کے لحاظ سے اس کے کروڑوں پرانی امت مسلمہ کے لاکھوں کے برابر ہی ہیں)

اس زوال کے بعد ہمارا دوسرا دور عروج شروع ہوا ۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یعنی اللہ نے مسلمانوں کو جن کے ہاتھوں پٹوایا تھا انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا پرچم تھما دیا۔ یہ دوسرا عروج، سلطنت عثمانیہ کا دور ہے۔ چار سو برس تک خلافت کا یہ ادارہ قائم رہا۔ اسے گویا بنی اسرائیل کی مکابی سلطنت کا دور سمجھئے۔

پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔

سابقہ امت مسلمہ پر بھی عذاب کا دوسرا مرحلہ یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا تھا، موجودہ امت پر بھی یورپی سامراج (European Imperialism) کا تسلط ہوا۔ سابقہ امت مسلمہ پر پہلے یونانی آئے پھر رومی آئے جبکہ ہم پر ولندیزی، انگریز اور اطالوی آئے۔

جو چار ادوار سابقہ امت مسلمہ پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت تک مکمل ہوئے تھے وہ اس امت پر رواں صدی کے آغاز میں پورے ہو گئے۔ سابقہ امت مسلمہ کے لئے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ " وان عدتم عدنا " (بنی اسرائیل : ۸) (اگر تم باز نہیں آؤ گے تو ہم تم کو سزا پر سزا دیتے رہیں گے) چنانچہ ان کی سزا جاری رہی یہاں تک کہ صرف اسی صدی میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہٹلر نے قتل کیا۔ انسانی تاریخ میں پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ انسانی لاشوں کو تلف کرنے کے لئے پلانٹ بنائے گئے ہوں۔ ایک طرف سے لوگ gas chamber میں داخل ہو رہے ہیں، کپڑے اتروا لئے گئے ہیں، ننگے داخل کئے جا رہے ہیں، مرتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پٹوں کے اوپر لاشیں جا رہی ہیں اور آگے جا کر مشینیں ان لاشوں کو چارے کی طرح کاٹ رہی ہیں --- بعد میں انہیں کیمیکل سے treat کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اتنی لاشوں کو ٹھکانے (dispose off) کیسے لگایا جائے۔ کون اتنی قبریں کھودے اور کون جلانے کی مصیبت اپنے سر لے۔ آخر میں ان پلانٹوں سے ایک سیاہ بدبودار مائع نکلتا تھا جس کو وہ اپنے کھیتوں میں کھاد کے طور پر پہنچا دیتے تھے! یہ سب اسی صدی کی بات ہے!!

آنے والے عذاب کی جھلک

اس ضمن میں جو تلخ ترین بات مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی "کاربن کاپی" ابھی امت مسلمہ پر آنے والی ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی حدیث جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہم کو مغربی استعماریت سے نجات دلا دی ہے لیکن ہم اب زیادہ بڑے امتحان میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ پہلے تو (بطور عذر) ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم انگریزوں، فرانسیسیوں اور اطالویوں کے غلام ہیں، اب تو غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن غلامی کے خاتمے کے باوجود دنیا میں

کوئی مسلمان ملک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس نظام کو قائم کر لیا ہو جو محمد رسول اللہ ﷺ کی امانت و وراثت کی حیثیت سے ہمارے پاس ہے۔ لہٰذا امتحان میں اس ناکامی کا نتیجہ تو نکلنا ہی ہے۔

خروج دجال بھی سامنے کی بات ہے۔ یہودیوں کو ابھی عظیم تر اسرائیل قائم کرنا ہے۔ اسکے نقشے میں تقریباً آدھا جزیرہ نمائے عرب موجود ہے۔ مدینہ سمیت مصر کے پورے زرخیز علاقے پر ان کا دعویٰ ہے۔ عراق میں وہ اسیری میں رہے ہیں اس لئے اس پر بھی ان کا دعویٰ ہے اور شام تو ان کی ارض موعود ہے۔ ترکی کا مشرقی حصہ بھی ان کے نقشے میں شامل ہے۔ ایک طرف ان کے یہ عزائم ہیں اور دوسری طرف کوئی مزاحمت سرے سے موجود ہی نہیں۔ عالم عرب میں سے کس میں دم ہے؟ عراق کے کچھ "ایٹمی دانت" نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تھا لہٰذا اسرائیل نے سعودی عرب کی فضائی حدود سے گزر کر عراق کے ایٹمی ری ایکٹر تباہ کر دیئے اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ خلیج کی جنگ میں نکل گئی۔ امریکی فوجی جنرل شواز کرافٹ نے صاف کہا ہے کہ ہم نے جنگ لڑی ہی اسرائیل کی حفاظت کے لئے ہے۔

نزول مسیح اور خروج دجال

حدیث مبارکہ میں جس "الملحمہ العظمی" (جنگ اعظم) کا ذکر ہے اس کے بارے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ اتنے انسان قتل ہوں گے کہ ایک پرندہ اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے سوائے لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ تھک ہار کر گرے گا تو لاشوں پر ہی گرے گا!

الملحمہ العظمی' خروج دجال اور دجالی فتنہ سے مراد کیا ہے؟۔ ایک چیز دجالی فتنہ ہے' اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اس فتنے میں تو ہم سب اس وقت مبتلا ہیں۔ ایک "المسیح الدجال" ہے۔ یہ درحقیقت ایک یہودی ہو گا۔ اس کا دعویٰ یہ ہو گا کہ "میں مسیح ہوں"۔ یہ دعویٰ اس بنیاد پر کرے گا کہ یہود کے ہاں حضرت مسیح کے بارے میں پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ یہودی ان کو اپنا نجات دہندہ مانتے آ رہے تھے۔ وہ نجات دہندہ حضرت مسیح ابن مریم تھے جن کی بعثت ہو بھی چکی لیکن یہود نے ان کا انکار کر دیا بلکہ اپنی طرف سے تو گویا ان کو سولی پر ہی چڑھا دیا۔ لہٰذا ان کی جگہ یہود کے خیال میں اب بھی خالی ہے۔ اب کوئی شخص یہود میں سے گریٹر اسرائیل قائم کرنے کا عزم مصمم لے کر اٹھے گا۔ اس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ صدام حسین کو تو امریکہ نے اس لئے رکھا ہوا ہے کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو پھر ایران کو آگے بڑھنے سے روکنے والی کوئی طاقت نہ رہے گی۔ صدام حسین اگر اب تک کرسی اقتدار پر ہے تو کوئی اپنی طاقت سے تھوڑا ہی ہے بلکہ اس کی اپنی تو کوئی حیثیت نہیں۔

اس طرح خود یہود میں ... خروج دجال ہو گا اور پھر "خون اسرائیل" ... نہیں خون اسمٰعیل جوش میں آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم' جو اولاد اسمٰعیل میں سے ہیں' کی امت سے وہ عظیم قائد اٹھے گا جو مہدی کے نام سے مشہور ہے (اگرچہ مہدی اس کا نام نہیں صفت ہے)۔

میں نے دانستہ "ظہور مہدی" کے الفاظ کے بجائے "عظیم قائد" کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اہل تشیع کے امام غائب کے ظہور کی طرف اشارہ نہ سمجھا جائے۔ ہمارے نزدیک عالم عرب سے ایک قائد ابھرے گا۔ اس کی قیادت میں مسلمان صالحین وہ جنگ کریں گے کہ آسمان سے بھی مدد آئے گی۔ حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گا اور یہ اصل عیسیٰؑ ہوں گے جو اس جعلی مسیح کو مقام لد پر قتل کریں گے۔ یہی وہ مقام ہے جو اس وقت "لڈا" کے نام سے اسرائیل کا سب سے بڑا Air Base ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ صلیب توڑ دیں گے' گویا صلیب کا عقیدہ ختم کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ مجھے تو کسی نے صلیب پر نہیں چڑھایا تھا' مجھے تو اللہ لے گیا تھا' اللہ ہی نے دوبارہ اتار دیا۔ تمہارا یہ عقیدۂ صلیب باطل ہے۔ اس کے علاوہ آپ خنزیر کو قتل کر دیں گے' گویا خنزیر کو حرام قرار دے دیں گے۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہو گا۔ شریعت موسویؑ اور شریعت محمدیؐ مل کر دنیا پر چھا جائیں گی اور اس طرح پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہو گا۔

لیکن اس سے پہلے بہت بڑی سزا امت محمدؐ بالخصوص اس کے سب سے افضل حصے کو مل کر رہے گی۔ اس اصول پر کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے

عربوں کا رتبہ بلند ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے تھے۔ پھر اللہ کی آخری کتاب ان کی زبان میں نازل ہوئی۔ ہمیں قرآن سمجھنے کے لئے بڑی محنت کرنی ہوتی ہے جبکہ عربی ان کی مادری زبان ہے۔

دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک ارب کی تعداد میں غیر عرب ہیں جبکہ عربوں کی تعداد پچیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر عرب مسلمانوں میں سے چالیس کروڑ تو جنوبی ایشیا' برعظیم پاک و ہند میں رہتے ہیں۔ ان چالیس کروڑ میں سے دس کروڑ مسلمانان پاکستان ہیں۔ دس گیارہ کروڑ بنگلہ دیش میں ہوں گے جبکہ بھارت میں کم از کم اٹھارہ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ عالم اسلام میں ثقافتی مراکز بھی دو ہی رہے ہیں۔ عربوں کے لئے ثقافتی مرکز مصر اور عجمی مسلمانوں کے لئے یہ برعظیم رہا ہے۔ ایک ہزار سال تک سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے جبکہ چار سو سال کے سارے مجددین یہاں پیدا ہوئے۔

اسلام کے نام پر تحریک اسی برصغیر میں چلی جس کا نتیجہ قیام پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں ہوں۔ ایک اعتبار سے پوری امت مسلمہ میں عربوں کے بعد سب سے بڑے مجرم ہم ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بعد فضل بھی سب سے زیادہ ہم پر ہی ہوا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں عظیم شخصیات یہیں سے ابھریں۔ علامہ اقبال جیسا مفکر یہاں پیدا ہوا' جس کے پائے کی شخصیت پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی۔ پوری دنیا میں صرف یہی ایک ملک ایسا ہے جو اس دور میں اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام معجزے سے کم نہیں ہے۔ چند مہینے پہلے جو گاندھی یہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان میری لاش پر ہی بن سکتا ہے' اسے پاکستان کو تسلیم کرنا پڑا۔ بہرحال پاکستان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ

"Hope for the best and be prepared for the worst"

(امید بہترین کی رکھو لیکن بدترین (حالات) کے لئے تیار رہو)

پاکستان میں خلافت کا احیاء

تاہم ایک بات میں تیقن سے کہہ سکتا ہوں کہ خلافت کا احیاء شروع یہیں سے ہو گا۔ اس لئے کہ پوری اسلامی دنیا میں صرف اور صرف یہ ملک ایسا ہے جس میں قرار داد مقاصد منظور ہوئی اور دس کروڑ عوام کی اسمبلی نے اعلان کیا کہ ہم حاکمیت سے دستبردار ہوتے ہیں۔ حاکمیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ ہمارے پاس جو بھی اختیارات ہیں وہ ایک امانت ہیں اور یہ انہی حدود کے اندر اندر استعمال ہوں گے جو اصل حاکم نے مقرر کر دی ہیں۔ باقی دنیا کے تمام ممالک کے دساتیر میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی ملک کے سرکاری مذہب کا نام اسلام لکھ دیا گیا ہے جو بہت محدود اور مبہم بات ہے۔

تبدیلی تو یہیں سے آئے گی لیکن اس تبدیلی کی عملی صورت یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ "Hope for the best" یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق دے دے اور بغیر کسی مزید عذاب اور سزا کے ہم اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ اور یہ توبہ کرنے والے اتنی معتدبہ تعداد میں ہوں جو جمع ہو کر یہاں پر انقلاب برپا کر دیں۔ معدودے چند افراد کی توبہ سے ظاہر ہے کہ کام نہیں چلے گا۔ اس توبہ کا آغاز بہرحال افراد سے ہو گا کہ ع

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا!

مگر کیا توبہ کی یہ توفیق ہم کو نصیب ہو گی؟ عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پچیس سال پہلے برس چکا ہے۔ مگر ہم ایک بار پھر اس عذاب کے مستحق بن چکے ہیں۔ تاریخ سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ عذاب کا وہ کوڑا کوئی معمولی تو نہ تھا۔ بدترین شکست ہوئی' پاکستان دولخت ہوا' ۹۳ ہزار فوجی اور سویلین اس ہندو کی قید میں گئے جس پر ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو پچیس سال کی مزید مہلت دی مگر افسوس! حالات اس طرف جا رہے ہیں کہ کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو نہ دہرائے۔ کسی قوم پر جب عذاب کے آثار شروع ہو جاتے ہیں تو پھر نہیں وہ ٹلا کرتا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی واحد مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے جس نے عذاب کے نمایاں آثار دیکھ کر اجتماعی توبہ کی اور اس کے نتیجے میں آتا ہوا عذاب ٹل گیا۔ یہی ایک راستہ مسلمانانِ پاکستان کے لئے بھی ہے کہ اجتماعی توبہ کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو پورا کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ کوئی پہلے سے بھی زبردست کوڑا ہماری پیٹھ پر برسے گا۔

تبدیلی کی دوسری عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دوسرے کوڑے کے بعد ہم ہوش میں آجائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بڑا مبارک کوڑا ہو گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولنذیقنھم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون" (السجدہ: ۲۱)

"ہم انہیں آخری بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے شاید کہ وہ لوٹ آئیں"۔

اسی چھوٹے عذاب کا ایک کوڑا ہم پر پڑا تھا لیکن دو ہزار میل دور ہونے کی وجہ سے ہم نے محسوس ہی نہیں کیا۔ کتنے لوگ مرے' کتنی عصمتیں لٹیں اور کتنے گھر اجڑ گئے' اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ڈھائی تین لاکھ پاکستانی ابھی تک وہیں پڑے ہیں اور جانوروں سے بدتر حالت میں ایک ایک کوٹھڑی میں پندرہ پندرہ انسان رہ رہے ہیں! اگر ہم بہرحال مکمل تباہی سے بچ گئے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تازہ مہلت عمل (Fresh release of existance) عطا کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکسن کا دل موڑ دیا' اس نے "Hot line" پر بھارت کو "ultimatum" دے ڈالا۔ کوسیجن نے بھی اندرا گاندھی کو حکم جاری کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مداخلت نہ ہوتی تو پھر جو تباہی آنی تھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا morale آسمان پر تھا جبکہ ہمارا پاتال میں۔ ہماری فضائیہ مفلوج ہو چکی تھی۔ ہمارے جہاز تو حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ روس کے دیئے ہوئے اواکس طیارے بھارت کو پاکستان میں اڑنے والی چڑیا کی بھی خبر کر دیتے تھے۔ وہ ہماری بحریہ کو کیماڑی میں مار کر چلے گئے تھے۔ ہمارا land defence ٹوٹ چکا تھا سوائے ہیڈ سلیمانکی کے۔ شکر گڑھ اور راجستھان میں ہمارا محاذ ٹوٹ چکا تھا۔ ان حالات میں امریکہ اور روس کے صدور کی مداخلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں کو پھیرنے کی قوت کا ظہور اور مغربی پاکستان کا بچ جانا اللہ کی مشیت کا مظہر ہے۔

بھارت میں ہندو مت کا احیاء

پاکستان کی تبدیلی کے حوالے سے تیسری اور آخری بات بہت بھاری دل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ بھارت میں ہندو مت کا احیاء بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ایودھیا کی مسجد گرانے کے لئے بھارت کے کونے کونے سے جو تین لاکھ کارکن پہنچے ہیں' ان کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے مگر مسلمانوں کو کہیں بھی گزند نہ پہنچایا۔ یہ کام ڈسپلن کے بغیر ممکن نہیں۔ نرے ہجوم کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ اعلیٰ تربیت یافتہ اور منظم کارکن تھے۔ ان کا بس ایک ہی مقصد تھا' بابری مسجد کو منہدم کرنا۔ وہ گرائی اور واپس آ گئے۔ فسادات جو ہوئے بعد میں ہوئے' جب مسلمانوں نے احتجاجی تحریک چلائی۔

میں یہ حقائق چھ سال کے عرصے سے بتا رہا ہوں کہ آر ایس ایس میں ۲۵ لاکھ کارکن موجود ہیں۔ ان سب کا مقصد اسلام اور پاکستان کا خاتمہ ہے۔ حال ہی میں ان کے تیسرے گرو "دیو داس" نے ہندوستان کی تمام ہندو سماجی' علمی' سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کو ایک سرکلر بھیجا ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستان کی زمین کو مسلمانوں کی نجاست سے پاک کر دیں۔ اس گرو نے مزید لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کچھ رد عمل ہو گا تو وہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہو گا جس کی ہمیں پرواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی پورے عالم اسلام میں کہیں رد عمل نہیں ہو گا۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کیوں لکھے ہیں کہ "میں تم کو یقین دلاتا ہوں ...."---- اس لئے کہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

مسٹر کلین ..... بولڈ

ان کی پارٹی میں شامل ہونے والے بیشتر افراد منزل مراد سے ہمکنار ہو چکے ہیں

اب تک یہی ہوا ہے کہ منظر عام پر آنے والے پس منظر میں چلے گئے

ایک ڈیڑھ ماہ سے ایک بار پھر وہ سرگرم عمل دکھائی دے رہے ہیں

محمد بدر منیر

پاکستان نیشنل پارٹی کے رہنما سید قسور گردیزی نے پاکستان کے سیاست دانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایئر مارشل اصغر خان کے بارے میں کہا تھا کہ ان کی مثال اس شہتیر جیسی ہے جو دریا کے تند و تیز سیلاب میں اچھلتا کودتا بہا جا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس سیلاب کی پیشوائی کر رہا ہے لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ سیلاب کی قوت اسے دھکیل رہی ہے۔ یہ اصغر خان کی وادی سیاست میں آمد آمد کا دور تھا اور گردیزی صاحب نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما تھے اور ڈھاکہ کے جناب احمد الکبیر کی رہائش گاہ پر اخبار نویسوں سے گپ شپ کر رہے تھے۔ اس محفل کو چھبیس سال سے زائد ہو چکے ہیں لیکن اصغر خان کے بارے میں گردیزی صاحب کا قول کرسی نشین ہوا۔ آج بھی اصغر خان سیاست میں اپنے اسی ابتدائی دور سے گزر رہے ہیں' کہتے ہیں کہ حاتم طائی کو جن سات سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی مہم سپرد کی گئی تھی ان میں "حمام باد گرد" کا سوال بھی تھا کہ اس میں داخل ہونے والا باہر نکلنے کا راستہ تلاش نہیں کر پاتا تھا اور اس کے اندر ہی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا تھا۔ ایئر مارشل صاحب کو ایئر فورس سے تو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا لیکن سیاست کے حمام باد گرد سے وہ جب بھی باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں کوئی ان دیکھا ہاتھ دوبارہ اس وادی خارزار میں آبلہ پائی پر مجبور کر دیتا ہے۔ پاکستان کی سیاست میں اصغر خان اپنی نوعیت کی واحد شخصیت ہیں۔

وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نمایاں ہوئے جب برطانوی حکومت نے سندھ میں حر مجاہدین کے خلاف کارروائی شروع کی' آسام کے بریگیڈیئر مجید کو اس ساری کارروائی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ معروف سیاسی رہنما حسین شہید سہروردی کے ہم زلف تھے اور قیام پاکستان کے بعد انہیں عراق کے شاہ فیصل ثانی کو قتل کرنے کی نام نہاد سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا تاکہ انہیں پاکستان کی افواج کا کمانڈر انچیف بننے سے روکا جا سکے۔ اصغر خان حروں کے خلاف کارروائی کے دوران انہی بریگیڈیئر مجید کے پائلٹ تھے اور ان کی "شاندار خدمات" کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انہیں کچھ انعامات وغیرہ بھی دیئے گئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد اصغر خان ایک بار پھر تصویروں کی حد تک منظر عام پر آئے ہیں جب بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ فضائیہ کے نوجوان افسروں کے گروپ فوٹو میں دکھائی دیتے ہیں۔ پھر وہ جنرل ایوب خان کے قریبی ساتھیوں میں شمار کئے جانے لگے' وہ ترقی کی منزلیں تیز رفتاری سے طے کرتے ہوئے فضائیہ کے کمانڈر انچیف بھی بن گئے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں رن کچھ کا معرکہ درپیش ہوا تو بری فوج نے فضائیہ سے "کور" طلب کیا لیکن اصغر خان نے "کور" فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ ایوب خان اپنے دوستوں کی بڑی بڑی غلطیوں کو نظر انداز کر دینے کے حق میں تھے۔ چنانچہ انہیں صرف یہ "سزا" ملی کہ فضائیہ کی سربراہی سے ہٹا کر پی آئی اے کی سربراہی دے دی لیکن اس سے قبل اصغر خان نے ایک اور کارنامہ انجام دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران انہوں نے حزب اختلاف کی صدارتی امیدوار اور بابائے قوم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو ہیلی کاپٹر استعمال کرنے سے جبراً روک دیا تھا اور انہوں نے یہ کام ایوب خان کو خوش کرنے کے لئے انجام دیا تھا۔ محترمہ اور ان کے رفقاء کار کو چٹا گانگ اور کھلنا کے قریب سمندری جزیروں کا دورہ سخت طوفانی موسم میں لانچوں کے ذریعے کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جب مادر ملت کی انتخابی مہم کے انچارج جنرل اعظم خان اور پرائیویٹ سیکرٹری حسن اے شیخ نے اس پر احتجاج کیا تو انہوں نے فرمایا کہ فوجی ہیلی کاپٹر ایک سویلین استعمال نہیں کر سکتا۔ لیکن جب دوسرے سویلین یعنی ایوب خان نے ہیلی کاپٹر استعمال کرنا چاہا تو انہیں کوئی روک ٹوک نہ کی گئی' مادر ملت اگر قائد اعظم کی ہمشیرہ نہ بھی ہوتیں تو صدارتی امیدوار کی حیثیت سے وہ اپنے مدمقابل صدارتی امیدوار کے مساوی سلوک اور مراعات کی بجا طور پر حق دار تھیں لیکن ایئر مارشل اگر یہ کام انجام نہ دیتے تو انہیں اصغر کون کہتا اور شاید ان کی یہی وہ ادا تھی جو ایوب خان کو بھا گئی اور بعد ازاں رن کچھ والے واقعے کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اس کے ٹھیک پانچ سال بعد جب ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو اصغر خان منظر عام پر

> "اصغر خان نے ایک کارنامہ یہ انجام دیا کہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران حزب اختلاف کی صدارتی امیدوار اور بابائے قوم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو ہیلی کاپٹر استعمال کرنے سے جبراً روک دیا"

نمودار ہوئے' ان کے بیانی مضامین ایک ایجنسی کے ذریعے اخبارات کو جاری کئے گئے' پہلے ایک اخبار نے خصوصی معاوضے پر (غالباً نوائے وقت نے) یہ مضامین شائع کرنے کے حقوق حاصل کئے بعد ازاں دوسرے اخبارات نے بھی ان مضامین کی اشاعت کے حقوق حاصل کرنے شروع کر دیئے یہاں تک کہ این پی ٹی کے اخبارات بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت مغربی پاکستان میں بھٹو سمیت متعدد لیڈر جیل میں تھے اور مشرقی پاکستان میں بھی کم و بیش یہی صورتحال تھی چنانچہ اصغر خان "حق کی آواز" بن کر سامنے آئے لوگوں میں وہ "مسٹر کلین" کی عرفیت سے بھی مشہور تھے۔ اگرچہ بعد میں ان کی کارکردگی کے باعث انہیں "مسٹر کلین --- بولڈ" بھی کہا جانے لگا۔ لاہور اور بعض دوسرے شہروں میں جلسے جلوس کے دوران انہوں نے بارہا یہ اعلان کیا کہ --- "وہ بھٹو کی رہائی کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے میدان میں آئے ہیں"--- وہ آزاد سیاست دان کے طور پر ایوب خان کی طلب کردہ گول میز کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے جبکہ وہ جس شخص کی رہائی کے لئے میدان میں آئے تھے وہ رہا ہو کر اس کانفرنس کے خلاف مہم چلانے میں مصروف تھا' گول میز کانفرنس کی ناکامی کے مرحلے پر انہوں نے "جسٹس پارٹی" کے نام سے اپنی سیاسی جماعت قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور چند ماہ بعد اسے ایک اور سیاسی جماعت پاکستان جمہوری پارٹی میں ضم کر دیا۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں نئی پارٹی کا صدر بنا دیا جائے گا لیکن انہیں نائب صدر کے عہدے پر ٹرخا دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے جمہوری پارٹی والوں سے ناراض ہو کر ایک اور نئی سیاسی جماعت "تحریک استقلال" بنانے کا اعلان کیا۔

تحریک استقلال نے موجودہ پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ میں کیا کردار انجام دیا؟ اس سوال کا جواب سب کو معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اصغر خان نے کیا کارگزاری دکھائی --- اصغر خان کو ۱۹۶۹ء میں امریکہ نے جھانسا دیا کہ وہ انہیں صدر بنانا چاہتا ہے' بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن دونوں نے اپنی اپنی جگہ بھی انہیں یقین دلایا لیکن جب وقت آیا تو اصغر خان جو قومی اسمبلی کے چار حلقوں سے انتخابات میں بری طرح ہار گئے اور پھر واقعات اتنی تیز رفتاری سے پیش آئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کریں' کدھر جائیں' یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء کی آخری سہ ماہی میں مشرقی پاکستان میں "بسکٹوں کی تقسیم" شروع ہوئی تو اکتوبر کے آخری دنوں میں وہ بھی اپنا حصہ لینے کے لئے ڈھاکا پہنچ گئے لیکن وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ بسکٹوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں چنانچہ وہ "ضمنی انتخابات" کا بائیکاٹ کر کے واپس مغربی پاکستان چلے آئے ---- سقوط مشرقی پاکستان کے المیہ کے بعد انہوں نے راولپنڈی میں مشتعل ہجوم کی قیادت کرتے ہوئے یحییٰ خان کی برطرفی اور منتخب نمائندوں کو حکومت حوالے کرنے کا مطالبہ کیا' انہیں اس مرحلے پر امید دلائی گئی کہ نئی اسمبلی انہیں اپنا صدر منتخب کر لے گی لیکن ان کی بجائے ایک بار پھر بھٹو کو صدر اور سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا اور اب ساری جدوجہد کا نتیجہ ایئر مارشل کو "آلو" کے خطاب کی صورت میں برآمد ہوا۔ اصغر خان نے ۱۹۷۲ء کے انیسویں دسمبر کو لاہور میں ایک جلوس نکالا' اس جلوس میں خواجہ محمد رفیق جیالوں کی فائرنگ کا شکار ہوئے اور اصغر خان وہاں سے سیدھے اپنی کمین گاہ میں پہنچ گئے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہیں اپنی زندگی کی واحد کامیابی نصیب ہوئی جب انہیں کراچی کے ایک حلقہ سے قومی اسمبلی کی ایک نشست ملی' لیکن اس نشست پر جو سونی صد اپوزیشن کی نشست تھی اصغر خان کا مقابلہ سندھ کے موجودہ گورنر کمال اظفر سے تھا لیکن حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کی متفقہ کوششوں کے باوجود وہ کمال اظفر کے مقابلے میں دو اڑھائی ووٹ سے کامیاب ہو سکے حالانکہ کہا جاتا ہے کہ اس نشست سے کوئی اور امیدوار ہوتا تو وہ ان کے مقابلے میں کمال اظفر کی ضمانت ضبط کرا سکتا تھا۔ یہ بات اور بھی دلچسپ ہے کہ الیکشن سے کچھ عرصہ قبل جب اصغر خان کراچی پہنچے تو کراچی ایئرپورٹ سے برنس روڈ تک لاکھوں افراد نے ان کا پرجوش خیرمقدم کیا' پورا شہر "راشہ راشہ اصغر راشہ" کے بلند آہنگ نعروں سے گونج اٹھا۔ اس دن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ امریکہ نے اصغر خان سے جو وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا لیکن انتخابات میں ان کی کارکردگی دیکھ کر امریکہ کو اپنا ارادہ اور وعدہ دونوں تبدیل کرنا پڑے اور ایک گمنام جرنیل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا اور اصغر خان اپنے گھر واقع ایبٹ آباد میں کئی سال تک نظربند رہے۔ اس دوران کوہالہ کے پل کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا تھا۔ بھٹو کو امریکہ نے اقتدار دیا اور اس نے نہ صرف اقتدار چھین لیا بلکہ "فخر ایشیا" کو زندگی سے بھی محروم کر دیا۔ اصغر خان کو ایک بار پھر امید دلائی گئی کہ اب انہی کی باری ہے' وہ سرگرم عمل بھی ہوئے لیکن وہ ۱۹۹۰ء پھر ۱۹۹۳ء میں بھی ناکام رہ گئے کیونکہ امریکہ نے ان کی بجائے تازہ دم امیدواروں کو ترجیح دی۔ ۱۹۹۴ء کا صدمہ ان کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ وہ نہ صرف یہ کہ ملک کی صدارت بلکہ اپنی جماعت کی صدارت سے بھی یہ کہتے ہوئے دستبردار ہو گئے کہ --- "میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا"----

اب ایک ڈیڑھ ماہ سے وہ ایک بار پھر سرگرم عمل دکھائی دے رہے ہیں' انہیں ایک بار پھر یقین دلایا گیا ہے کہ پاکستان کی صدارت یا ایوان صدر ان کے حوالے کر دیا جائے گا چنانچہ وہ نئی حکمت عملی کے تحت میدان میں آ گئے ہیں' ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ ماضی میں جس طرح بھٹو اور ضیاء الحق ان کا کاندھا استعمال کرتے ہوئے ایوان صدر میں داخل ہوئے تھے اسی طرح وہ بھی اس بار عمران خان کا کاندھا استعمال کرتے ہوئے ایوان صدر میں داخل ہوں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ عمران خان کا کاندھا استعمال کرتے ہیں یا عمران خان ان کا کاندھا۔ یا دونوں حضرات ایک دوسرے کے کاندھے کو استعمال کرنے کی حسرت دل میں لئے پس منظر میں چلے جائیں گے کیونکہ اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ منظر عام پر آنے والے پس منظر میں چلے گئے اور "مردے از غیب می آید وہ کارے می کند" کے محاورے پر حرف بہ حرف عمل ہوا ہے۔

۱۹۷۲ء میں ایئر مارشل کو ایک فقرہ استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا' وہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب تحریک استقلال برسراقتدار آئے گی تو ایوان صدر اور گورنر ہاؤسوں کو یتیم خانہ بنا دے گی"۔ راقم الحروف نے ایک دو بار گزارش بھی کی کہ "خان صاحب! یہ جملہ کچھ اچھا نہیں ہے"۔ لیکن نہ جانے انہیں اس جملے میں کیا خوبی دکھائی دی کہ وہ اسے استعمال کرتے ہی رہے اور جملہ یتیم ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے لاہور میں میاں محمود علی قصوری کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنا یہ پسندیدہ فقرہ پھر دہرایا تو راقم الحروف سے رہا نہیں گیا گزارش کی کہ "جب آپ اور آپ کی پارٹی اقتدار میں آئے گی تو ایوان صدر اور گورنر ہاؤس تو کجا پورا ملک ہی یتیم خانے میں تبدیل ہو جائے گا"--- اس پر وہ ناراض تو کافی ہوئے لیکن میاں صاحب نے انہیں کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا کیا اور انہیں اس جملے کی ادائیگی سے پرہیز کرنے پر بھی آمادہ کر لیا۔

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

بھارت نے پہلا ایٹمی دھماکہ لاہور سربراہ کانفرنس کے ٹھیک تین ماہ بعد کیا'

۶۵ء میں پاکستان نے یہ سمجھا کہ کشمیر کے مسئلے کو طاقت سے حل کرانے کا یہ موقع ہے

کانفرنس سے ہندوستان کے نکالے جانے یا اس کی طرف سے احتجاج پر کسی ایک ملک کو بھی افسوس نہ ہوا

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان تحریر : عمران این حسین

انڈیا اور سربراہ کانفرنس

ہندوستان کو سربراہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینا اور پھر پاکستان کے بائیکاٹ کرنے پر اس کے کانفرنس سے نکالے جانے کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ کانفرنس کا جو سرکاری اعلامیہ جاری کیا گیا تھا اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی کانفرنس میں شرکت کا ذکر بھی تھا۔ ۲۵/ ستمبر کو جب یہ اعلامیہ جاری کیا گیا اسی شام بھارتی وفد کے سربراہ فخرالدین علی احمد نے ایک بیان جاری کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "اعلامیہ کا یہ حصہ حقائق پر مبنی نہیں کیونکہ ہندوستان کے کسی نمائندے نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی"۔ انہوں نے مزید کہا کہ شرکت کی دعوت "حکومت ہند" کو دی گئی تھی۔

کانفرنس کے ترجمان نے پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اختتامی اجلاس میں بالفعل موجود نہیں تھا۔ احمد نے اس بیان کا یہ کہہ کر پول کھول دیا کہ اس سے یہ تاثر مل سکتا ہے کہ "ہمارا وفد اپنی خوشی سے شریک نہیں ہوا" لیکن انہوں نے کہا کہ "حقیقت یہ نہیں' اصل میں ہمارے وفد کو کل (۲۴ ستمبر) یا آج (۲۵ ستمبر) کو نہ تو اجلاس کے وقت کا بتایا گیا اور نہ ہی پروگرام کی کوئی اطلاع دی گئی۔ اس لئے ہم کسی بھی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ہم صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ انتہائی خلاف معمول اور افسوسناک تھا"۔

ہندوستان واپس جا کر احمد نے "رباط کانفرنس سے اپنے ملک کی بیدخلی کی روشنی میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا نئے سرے سے جائزہ لینے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بحث کا آغاز ہو گیا جس پر حکومت کو اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کی کوشش کا بڑی مشکل سے دفاع کرنا پڑا۔ پریس اور لوک سبھا میں حکومتی پالیسی پر تنقید کے جواب میں وزیر خارجہ دنیش سنگھ نے ۱۵/ اکتوبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ انہوں نے اس میں تسلیم کیا کہ گزشتہ پانچ برس سے ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ کشمیر کے مسئلے اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر بحث مباحثے اور قراردادوں سے بچنے کے لئے بین الاقوامی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی کوشش کی جائے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ پاکستان کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کانفرنسوں کو کشمیر کے مسئلے پر مدد حاصل کرنے اور ہندوستانی مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات پر قراردادیں منظور کرانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ ہندوستان کو معلوم تھا کہ پاکستان رباط کانفرنس میں یہی کچھ کرے گا لہٰذا ہندوستان کو اس کانفرنس میں شرکت کی کوشش کرنی پڑی۔

پاکستان کے دفتر خارجہ نے ۲۲/ اکتوبر کو ہندوستانی وزیر خارجہ کی تقریر کا کہہ کر جواب دیا کہ پاکستان کا سربراہ کانفرنس میں پاک بھارت تنازعات کو "گھسیٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا"۔ بھارتی وزیر کے اس الزام کے جواب میں کہ "پاکستان مذہبی شدت پسندی کا سہارا لے کر ہندوستان اور مغربی ایشیاء کی ترقی پسند قوتوں کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے" پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اسلامی اتحاد کو اپنے مفادات کے لئے خطرہ تصور کرتا ہے اور اس کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے"۔ ایک پاکستانی سفارت کار نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ "رباط کانفرنس کے بارے میں ہندوستانی کے عزائم سخت خطرناک تھے"۔

"ہندوستان کانفرنس میں ہر حال میں داخلہ حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا تاکہ مسلمان ملکوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرے خواہ اس کے لئے سفارتی سطح پر اسے خفت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے"۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ اسلامی اتحاد اور اسلامی کانفرنسوں کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی واضح اور معین مقصد لئے ہوئے تھی۔ یعنی اسلامی بلاک کے قیام کو روکنا اور پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر اسلامی ممالک کی حمایت سے محروم رکھنا۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے حالات پر قراردادوں کی پیش بندی کا مقصد ہندوستانی حکومت کو پریشانی سے بچانا ہوتا تھا۔

اسلامی بلاک کے قیام کے بارے میں نہرو کا موقف بالکل واضح تھا یعنی یہ کہ "مذہبی بنیادوں پر علاقائی گروہ بندی امن کی بجائے جنگ کی طرف لے جائے گی"۔

۱۹۶۸ء میں اندرا گاندھی نے ہندوستانی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستان اسلامی بلاک کے کسی بھی شکل میں قیام کی مخالفت کرے گا کیونکہ اس طرح کی مذہبی گروہ بندی اس خطے میں نئی کشیدگی پیدا کرے گی!! انہوں نے کہا کہ بیشتر افرو ایشیائی ممالک اسلامی بلاک کے قیام کے خلاف ہیں۔

تاہم عین ممکن ہے کہ اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی یہ پالیسی ورلڈ مسلم کانگرس کے ۱۹۶۲ء میں بغداد میں منعقد ہونے والے اجلاس کے بعد وضع کی گئی ہو۔ عراقی حکومت نے اس اجلاس پر خصوصی توجہ دی تھی۔ عراق کے صدر' جنرل قاسم نے نہ صرف اجلاس کا افتتاح کیا بلکہ اس کی پوری کارروائی کے دوران قریبی رابطہ قائم رکھا۔ کانگرس نے صدر قاسم اور عراقی وفد کو کویت کا مسئلہ نہ اٹھانے پر بھی مائل کر لیا تھا۔ (عراق کا پورے کویت پر ملکیت کا دعویٰ تھا) اس وجہ سے یہ اجلاس بین الاقوامی توجہ حاصل کرنے

میں کامیاب ثابت ہوا۔

اس کانفرنس میں ہندوستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ متعدد ممتاز ہندوستانی مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگران میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کانفرنس میں کشمیر کے جھگڑے اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات پر قراردادیں منظور کی گئیں۔ پاکستانی وفد کا دعویٰ تھا کہ ان قراردادوں کے پیش کرنے یا ان کے لئے تائید حاصل کرنے اور انہیں منظور کرانے میں اس کی کوشش شامل نہیں سب کچھ برادر ممالک نے کیا۔ کشمیر کے بارے میں کانفرنس نے یہ موقف اختیار کیا کہ تمام عوام کو' خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے خود مختاری کا حق حاصل ہے۔ کانفرنس نے اقوام متحدہ پر زور دیا کہ وہ اپنی منظور کردہ قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے موثر اقدامات کرے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کانفرنس نے ہندوستانی مسلمانوں پر بار بار دہرائے جانے والے مظالم کی مذمت کی اور ہندوستانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہاں مسلم اقلیت کی حفاظت' ان کے جان و مال کا تحفظ' مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور اپنی ثقافت کو بلا روک ٹوک ترقی دینے کے ان کے حق کو یقینی بنائے۔

یہ سمجھنا قرین قیاس ہے کہ ایک اہم نیم سرکاری کانفرنس میں ان دو قراردادوں کی منظوری نے ہندوستان کی حکومت کو اپنے دفاع اور تحفظ کے لئے ایسی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ چنانچہ ہندوستان نے پہلے ۱۹۶۴ء میں مغادیشو' صومالیہ میں منعقد ہونے والی ورلڈ مسلم کانگرس میں چالاکی دکھائی۔ صومالیہ نے ان جانے میں کہہ دیا کہ وہ بڑی خوشی سے کانفرنس میں شرکت کر سکتا ہے۔ کانگرس کے سیکرٹری جنرل سے نہ تو اس بارے میں کسی نے مشورہ کیا اور نہ اسے اطلاع ہی دی۔ جب اجلاس شروع ہوا تو وہاں ہندوستانی وفد موجود تھا۔ کانگرس کے سیکرٹریٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کی تین تنظیموں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہندوستانی حکومت نے انہیں وفود بھیجنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اپنا ایک وفد منتخب کر کے شرکت کے لئے بھیج دیا جس نے کانفرنس میں اپنے آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کا وفد ظاہر کیا۔

پیشتر اس کے کہ ہندوستانی وفد کے کاغذات چیک ہوتے اور کانفرنس کو جعل سازی کا پتہ چلتا وفد افتتاحی اجلاس میں شریک رہا۔ ہندوستانی وفد کا کہنا تھا کہ وہ صومالی حکومت کی دعوت پر شرکت کر رہا ہے۔ کانفرنس نے بتایا کہ صومالیہ کی حکومت کو شرکت کی دعوت دینے کا اختیار نہیں صرف سیکرٹریٹ شرکت کی دعوت دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی وفد کو کانفرنس سے جانا پڑا۔

یہ مسئلہ جب لوک سبھا میں پیش ہوا تو خارجہ امور کے ڈپٹی وزیر نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ صومالی حکومت کی دعوت پر ہمارا وفد شرکت کے لئے گیا تھا لیکن جب خود صومالیہ کی حکومت کے اختیار کا مسئلہ کھڑا ہوا تو اسے واپس بلا لیا کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایک "دوست" حکومت کو آزمائش میں ڈالا جائے۔

ہندوستانی وفد کی سربراہی کے لئے سرینگر میں کشمیری حکومت کے ایک وزیر' سید علی محمد طارق کے انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستانی حکومت نے یہ سارا ڈرامہ کشمیر کے بارے میں دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے کھیلا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کانفرنس نے کشمیری عوام کے حق خود اختیاری اور ہندوستان میں مسلمان اقلیت کے بارے میں قراردادیں منظور کر لیں۔

اگلے سال اپریل ۱۹۶۵ء میں حج کے موقع پر ورلڈ مسلم کانفرنس مکہ میں منعقد ہوئی۔ اس کا اہتمام ورلڈ مسلم لیگ (رابطہ عالم اسلامی) نے کیا تھا۔ رابطہ کے جنرل سیکرٹری کی طرف سے ہندوستان کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جو وفد بھیجا گیا لیگ نے اسے قبول کر لیا لیکن کانفرنس سے دو ماہ قبل ہندوستانی حکومت نے دو اہم کشمیری راہنماؤں' شیخ عبداللہ (جسے ۱۰ سال جیل میں رکھنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے رہا کیا گیا تھا) اور مرزا افضل بیگ کو حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ان دونوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کی۔

مغادیشو کی طرح مکہ میں بھی ہندوستان کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مرتبہ مختلف ممالک کے وفود نے کانفرنس ہال کے باہر ہندوستانی پرچم کی موجودگی پر احتجاج کیا۔ چنانچہ ہندوستانی پرچم اتار لیا گیا۔ ہندوستانی سفیر نے ہندوستانی وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا تو اس میں بھی کسی غیر ہندوستانی نے شرکت نہ کی۔ کانفرنس میں شریک وفود نے دراصل ہندوستان کے "سرکاری" وفد کی شرکت پر ناپسندیدگی کے اظہار کے طور پر یہ رویہ اپنایا تھا کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی وفد مسلمانوں کا نمائندہ نہیں۔

ہندوستان کے سرکاری وفد اور شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کی کانفرنس میں موجودگی نے مسئلہ کشمیر کو سب سے اہم آئٹم بنا دیا۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی کی مذمت اور کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی تائید میں نہایت سخت اور لمبی چوڑی قراردادیں منظور کی گئیں۔ شیخ عبداللہ اور ہندوستانی مسلمان اقلیت کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لئے الگ قراردادیں منظور ہوئیں۔ یہاں پنڈت نہرو کی وہ دھمکی یاد دلا دیں جس کے الفاظ یہ تھے۔ "مذہب پر مبنی علاقائی گروہ بندیاں امن کی بجائے جنگ کا باعث ہوں گی"۔ اس کا ظہور اب جا کر ہوا۔ ۱۹۶۵ء کے وسط میں پاکستان نے سمجھا کہ مغادیشو اور مکہ کانفرنس سے اس کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو گئی ہے۔ ادھر شاہ فیصل نے ایک اور سربراہ کانفرنس کا اعلان کیا تو اسے مزید حوصلہ ہوا اور یہ سمجھا کہ کشمیر کے مسئلے کو طاقت سے حل کرانے کا یہ موقع ہے۔ اگست ۱۹۶۵ء کا پورا مہینہ کشمیر کے اندر لڑائی ہوتی رہی لیکن ۶/ ستمبر کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد پر جنگ شروع ہو گئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسری کئی باتوں کے ساتھ اسلامی یک جہتی کی پشت پناہی نے پاکستان کو اگست ۱۹۶۵ء میں کشمیر میں کارروائی کا راستہ دکھایا۔ دوسری طرف بعد میں ۱۹۶۹ء کی رباط سربراہ کانفرنس اور ۱۹۷۰ء میں منعقد ہونے والی اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی دو کانفرنسوں کی کامیابی سے ہندوستان کو یہ خدشہ ہوا کہ اسلامی یک جہتی میں اضافہ پاکستان کے لئے تحفظ کا باعث ہو گا اور ہندوستان کے لئے آئندہ طاقت کے زور پر برعظیم کی تقسیم کے خاتمے یا اس میں ردوبدل کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کی شکل میں برآمد ہوا جس میں پاکستان کا مشرقی حصہ کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اور یہ بھی نرا اتفاق نہیں تھا کہ ہندوستان نے مئی ۱۹۷۴ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ لاہور سربراہ کانفرنس کے ٹھیک تین ماہ بعد کیا۔

اگلی بین الاقوامی کانفرنس اپریل ۱۹۶۹ء میں کوالالمپور میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کو بطور مبصر شرکت کی دعوت دی گئی۔ بعد میں اس میں تبدیلی کر کے اسے بھرپور شرکت کا موقع فراہم کر دیا گیا۔ پاکستان نے اسلامی ممالک کے اجلاس میں ہندوستانی حکومت کے نامزد کردہ وفد کی شرکت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ ۵ ماہ بعد رباط میں ہندوستان کی شرکت اس نے اس شرط پر قبول کی تھی کہ ہندوستانی حکومت کے وفد کو مسلمانوں کا وفد قرار نہ دیا جائے۔ پاکستان کا رباط سے قبل یہ فیصلہ ہندوستان کا یہ حق تسلیم کر لینے کے مترادف تھا کہ وہ اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ وفد منتخب کر سکتا ہے۔ پاکستان کو رباط سربراہ کانفرنس میں

ہندوستان کی شرکت پر یہ اعتراض تھا کہ وہ مسلمان ملک نہیں ہے۔ جب صدر یحییٰ نے سعودی عرب کے دباؤ پر ہندوستان کی شرکت پر رضامندی ظاہر کی تھی تو اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ وفد بھیجنے کی دعوت ہندوستانی حکومت کو دی جائے گی۔ یہ بات شاہ فیصل کو بھی معلوم تھی۔ چنانچہ کانفرنس کی طرف سے ہندوستانی حکومت کو ہی یہ دعوت دی گئی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد بھیجے۔

یحییٰ خان کو بعد میں جب یہ احساس ہوا کہ اسے واپس جا کر مظاہروں کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس نے بہانے تلاش کرنے شروع کئے۔ بالآخر اس نے یہ عذر پیش کیا کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے منتخب کردہ وفد کی شرکت پر رضامندی ظاہر کی تھی نہ کہ ہندوستانی حکومت کے وفد پر لہٰذا ہندوستان کے سرکاری وفد کی شرکت قبول نہیں کی جاسکتی۔ مذکورہ بالا رائے کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ دوسرے روز بعد دوپہر کے پہلے اجلاس میں یحییٰ خان آخر تک موجود رہے مگر انہوں نے ہندوستانی سفیر گوربچن سنگھ کی موجودگی پر کوئی احتجاج نہ کیا' حالانکہ ہندوستانی سفیر نے اپنے وفد کی طرف سے عام بحث کے دوران ایک تقریر بھی کی اور اجلاس کی پوری کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی وفد سے بھی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ پہلی غلطی جس کی طرف ہم نے اس سے قبل بھی اشارہ کیا تھا یہ تھی کہ ہندوستان کے سکھ سفیر کو وفد کے مسلمان سربراہ فخرالدین علی احمد کے پہنچنے تک کانفرنس میں شرکت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ عین اس وقت جبکہ ہندوستان میں سنگین مسلم کش فسادات جاری تھے ہندوستان کو چاہئے تھا کہ صرف مسلمانوں پر مشتمل وفد بھیجتا۔ ہندوستانی سفیر اگر معمولی سی عقل سے بھی کام لیتے تو نہ صرف ہندوستان کا بھرم رکھ سکتے تھے بلکہ الٹا یحییٰ خان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنتے۔ ہندوستانی وفد نے دوسری حماقت یہ کی کہ اس نے پورے ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ مسلم کش فسادات ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے جسے کانفرنس میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔

ستمبر سے لے کر کانفرنس کے افتتاح تک ہندوستان اس بنا پر کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہیں ظاہر ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے لئے جس کی ۸۵ فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے' اسلامی ممالک کی کانفرنس میں شرکت کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ہندوستانی وفد خواہ وہ حکومت کا ہی مقرر کردہ تھا' مسلمانوں پر مشتمل ہونا چاہئے تھا۔ بالکل یہی معاملہ ۵ ماہ قبل کوالالپور میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے موقع پر ہو چکا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ احمد آباد میں ہونے والے فسادات کی عالمی پریس میں زبردست تشہیر ہوئی تھی اور بلاشبہ یہ نہایت ہی سنگین فسادات تھے لیکن ہندوستان کی حکومت کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ ہندوستان سرکار کے ایک وزیر مسٹر چاوان کھلے عام ایک جنگجو ہندو تنظیم "جنگ سنگھی" کو ان فسادات کا ذمہ دار ٹھہرا چکے تھے۔ لہٰذا اس کا امکان نہیں تھا کہ کانفرنس میں ہندوستانی حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا۔ سربراہ کانفرنس آسانی سے یہ بات مان لیتی کہ ہندوستان کی حکومت نے جو انکوائری کمیشن مقرر کیا ہے اسے یہ فیصلہ کرنے دیا جائے کہ ان فسادات کا کون ذمہ دار ہے۔ مسلم ممالک کے سربراہان زیادہ تر متاثرین کی امداد' تباہ کی گئی مساجد کی دوبارہ تعمیر اور آئندہ کے لئے مسلمانوں کے تحفظ جیسے امور سے متعلق یقین دہانی حاصل کرنا چاہتے۔

ہندوستان نے یہ کہہ کر کہ کانفرنس اس پر بحث نہیں کر سکتی جو حمایت حاصل تھی وہ بھی کھو دی۔ چنانچہ کانفرنس سے ہندوستان کے نکالے جانے یا اس کی طرف سے احتجاج پر کسی ایک ملک کو بھی افسوس نہ ہوا۔ رہا یہ خیال کہ رباط کانفرنس میں شرکت سے ہندوستان کا مقصد اتحاد اسلامی کی کوششوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستانی وفد کا رویہ مختلف ہوتا۔ جب انہیں شرکت کے لئے دعوت مل گئی تھی تو پاکستان کے ساتھ محاذ آرائی میں وہ اپنے دوستوں سے ہاتھ دھونے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے۔ بلکہ اس لحاظ سے ہندوستانی سفیر کو داد دی جانی چاہئے کہ اصل مقاصد جو بھی تھے انہوں نے خود آگے بڑھ کر احمد آباد کے فسادات پر کانفرنس میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔

اگر ہندوستانی سفیر ہوشیاری سے کام لیتا تو یحییٰ خان کو دو میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ یعنی یا تو صاف صاف ہندوستانی وفد کی شرکت قبول کر کے اپنے اقتدار سے ہاتھ دھو لیتے ورنہ پھر ڈٹ کر ہندوستان کی شرکت کی مخالفت کرتے جس کا نتیجہ کانفرنس میں پھوٹ کی شکل میں برآمد ہوتا ظاہر ہے یحییٰ خان یہ دوسرا راستہ اختیار کرتے۔

(جاری)

کیا زوخر ددایوف زندہ ہیں؟

یہ سوال اس وقت ابھرا جب چیچن کمانڈر سلمان ددایوف دوبارہ منظر عام پر آئے۔ سلمان ددایوف کو اس وقت بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی تھی جب گزشتہ جنوری کو وہ روس کے قائم کردہ تین حفاظتی حصار توڑ کر یموسکی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے دو ماہ بعد روسی انٹر فیکس نیوز ایجنسی نے خبر دی تھی کہ سلمان ددایوف کو ۳/ مارچ کو اروس مارٹن نن (Urus Martinan) کے قریب سرنووسک میں حملہ کر کے شہید کر دیا گیا ہے خبر میں بتایا گیا تھا کہ ان کی موت ہسپتال میں واقع ہوئی ہے۔

لیکن چیچنیا سے آنے والی خبروں میں کہا گیا تھا کہ ددایوف شدید زخمی ہوئے تھے' ایک گولی ان کی آنکھ میں لگی تھی لیکن انہیں ملک سے باہر لے جا کر علاج کروایا گیا اور وہ بچ گئے ہیں۔

۱۷/ جولائی کو ددایوف کو ایک پریس کانفرنس میں دیکھ کر بہت سے مبصرین حیرت زدہ رہ گئے۔ مزید براں نوجوان چیچن کمانڈر نے بتایا کہ ددایوف بھی زندہ ہیں۔ ددایوف کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ گزشتہ اپریل میدان جنگ سے' فون پر بات کرتے ہوئے روسی میزائل حملے میں شہید ہو گئے تھے۔

لیکن اب انکشاف کیا گیا ہے کہ وہ خطرے کی حالت میں ہیں مگر ابھی زندہ ہیں۔ ان کی اہلیہ بھی چیچنیا میں نہیں' ہو سکتا ہے اپنے آبائی ملک اسٹونیا گئی ہوں؟ مزید تفصیلات کا انتظار ہے

(کرینٹ انٹرنیشنل)

عزیٰ کسی دیوی کا نام نہیں' یہ ایک کیکر (یا ببول) کا درخت تھا!

محمود کے مرنے کے بعد سومنات کی فتح کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا

مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں نہیں بلکہ شمال مغربی عراق میں اربیلا کے میدان میں ہوئی

مولانا محمد اشرف

سب سے پہلے دنیا میں بت پرستی کی داغ بیل آل قابیل نے ڈالی کیونکہ انہوں نے اپنے سرداروں کے نام پر ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کے بت تراشے۔ یہ بت طوفان نوح سے قبل تراشے گئے اور طوفان کے بعد ساحل جدہ سے دستیاب ہوئے تو عمرو بن لحی نے ان کو عربوں میں عام کیا اور پانچ مختلف قبائل کو یہ بت دیئے گئے۔ جوں جوں قبائل میں اضافہ ہوتا گیا' نامی گرامی شخصیات مورتیوں کی شکل میں اپنے اپنے قبائل کا اثاثہ بنتی گئیں۔ بہرحال ۸ھ سے قبل تمام عرب میں بت پرستی کا عام رواج تھا۔ ان بت پرستوں کی نظر میں کعبتہ اللہ کی بزرگی تین سو ساٹھ بتوں کی وجہ سے تھی۔ خانہ کعبہ کے عین سامنے ہبل کا بت نصب تھا' گویا بیت اللہ کی بزرگی کا وہ معیار بدل گیا تھا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے قائم کیا تھا۔

ان بت پرستوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لات' عزیٰ اور منات کو حدود حرم کے تین مقام تصور کرتے ہوئے یہیں سے احرام باندھ کر کعبے میں جانا شروع کیا۔

یہ مضمون چونکہ تین بتوں سے متعلق ہے لہٰذا ہر بت کے بارے میں الگ الگ لکھا ہے اور سب سے پہلے لات' پھر عزیٰ اور اس کے بعد منات کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے اور آخری بت کے بارے میں زیادہ تفصیل جمع کی ہے اور سومنات پر محمود غزنوی کے حملے تک جائزہ شامل ہے۔

لات

اس کے بارے میں مولانا سید عبدالدائم الجلالی لکھتے ہیں۔ "لات کا نام نبطی تھا۔ اقوام بابل کی دیویوں میں سے یہ ایک دیوی تھی۔ رب الارباب یعنی خدائے خدائگاں کی بہن یا بیٹیاں جہاں مامنائو (منات) اور اشار تھیں وہاں لات بھی ایک بہن یا بیٹی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ لات کو (نعوذ باللہ) خدا کی بہن یا بیٹی کا درجہ دیا گیا' لیکن یہ درجہ کئی صدیوں بعد دیا گیا' کیونکہ نہ تو لات کسی دیوی کی شکل پر تھی اور نہ کسی دیوتا کی شکل پر اور نہ اس کا نام نبطی تھا بلکہ اولاد آدم میں قابیل کا ایک بھائی نبطی تھا۔ جس کی قوم نے سورج کی پرستش شروع کی"۔ "ولسن کی یہ صراحت کہ لات سورج کی دیوی تھی صحیح ہے۔ اس کی تائید اسٹرالو کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نبطی لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے"۔

لیکن اہل حجاز کی رائے لات کے بارے میں یہ ہے کہ "ایک نیک شخص تھا (جو) موسم حج میں حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا۔ اس کی موت کے بعد لوگوں نے اس کی قبر پر مجاورت شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اس کی عبادت کرنے لگے"۔ تقریباً یہی رائے لغات القرآن میں ابن عربی سے بھی نقل کی گئی ہے۔ حالانکہ لات طوفان نوح سے پہلے کا ہے کیونکہ نبطی قوم طوفان نوح سے قبل کی ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم کی تعمیر کعبہ کے بعد لات کو ایک نیک شخص سے تشبیہ دینا درحقیقت لات کے تقدس میں ایک اضافی کوشش ہے۔ یہ حتمی بات ہے کہ لات نبطی قوم کی ایک دیوی تھی جس کا درجہ کم از کم سورج کی دیوی کے طور پر تھا' لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کو بغداد یعنی بابل سے دسرتھ کے زمانے میں منتقل کیا گیا یا حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد۔ جہاں تک اہل بابل کا تعلق ہے' یہ لوگ مذہبی اور سیاسی طور پر مصریوں کے ماتحت تھے اور بابل کی حکومت ایک طرح سے مصری حکومت کا صوبہ تھی' لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دونوں خاندانوں کے قریبی تعلقات قائم تھے' کیونکہ دسرتھ کی "لڑکی فرعون مصر آخنیطون سے بیاہی گئی تھی"۔ یہ وہی دسرتھ ہے جس کو ہندوستان میں رام کا بیٹا کہا جاتا ہے' اور آخنیطون کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اس نے بت پرستی اور بت تراشی قطعاً ممنوع قرار دے دی تھی"۔ لہٰذا ممکن ہے لات بھی اسی دوران مصر و بابل سے دور مقام پر لے جایا گیا ہو اور یہ مقام ہی حجاز ہو' لیکن تاریخی شہادتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک نہ تو کعبہ تعمیر ہوا تھا اور نہ اس مقام پر آبادی تھی' لہٰذا یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ اس کی عبادت چوری چھپے اہل بابل کرتے رہے ور حضرت ابراہیم کے نقل وطن کے کچھ عرصے بعد اس کو بھی حجاز میں لے جایا گیا جہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم (اس کو) پوجتی تھی اور زمانہ جاہلیت تک اس کی پرستش برابر جاری رہی۔

یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لات کی شکل و صورت کیا تھی کیونکہ نہ تو یہ انسانی شکل کے مشابہ تھا اور نہ کسی جانور کی شکل کے' بلکہ صرف چوکور پتھر تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں۔ "لات ایک سفید منقش پتھر تھا۔" گویا لوگوں نے پتھر کی سفیدی کو سورج کی روشنی پر محمول کر کے ایک امتیازی درجہ دیتے ہوئے لات کی عبادت اسی طرح شروع کر دی جس طرح سورج کی کرتے تھے۔

پتھر کی سفیدی یا روشنی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تسلیم کیا اور کعبے کی دیواروں میں حجر اسود کو نصب کیا تاکہ طواف کی ابتداء کے لئے مقام متعین کیا جا سکے۔ اس کے بارے میں تاریخ مکہ میں تحریر ہے۔ "اس پتھر کا نور اس وقت اس درجہ روشن تھا کہ اس سے خانہ کعبہ کے ہر طرف کے مذابح چمکتے تھے لیکن کفر کی نجاستوں اور بنی آدم کے گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا"۔

غرض لات کو عرب قبائل میں سے قبیلہ ثقیف کی حمایت حاصل تھی جس طرح منات کو اوس و خزرج کی اور عزیٰ کو بنی ہاشم و بنی اسد کی۔ لیکن لات کو "ان لوگوں نے لفظ اللہ سے لفظ لات بنایا تھا' گویا اس کی مونث قرار دیا تھا"۔ یوں تو تینوں ہی مونث

تھے لیکن اللہ کی مونث صرف ، لات تھا۔ سورۂ نجم کی ۱۹ تا ۲۶ آٹھ آیتیں اسی بارے میں ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ

"تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا؟ اور منات تیسرے پچھلے کو۔ کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری۔ یہ لوگ تو صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں' یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا ہر شخص جو آرزو کرے اسے میسر ہے؟ اللہ ہی کے قبضے میں ہے یہ جہان اور وہ جہان۔ بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی' مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لئے چاہے اجازت دے دے۔"

گویا اس آیت میں بت پرستوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ خدا کے ہاں یہ بت سفارش کا ذریعہ نہیں بن سکتے یہاں تک کہ فرشتے بھی سفارش نہیں کر سکتے' بلکہ صرف خدائے واحد کی عبادت باعث نجات ہو سکتی ہے۔ مسلمان چونکہ ان بتوں کو لائق عبادت یا ذریعہ نجات نہیں مانتے تھے لہٰذا پہلا کام فتح مکہ کے بعد یہ ہوا کہ ان بتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ خود حضور اکرم ﷺ نے "کعبے کے اندر باہر اور ہر طرف جس قدر اصنام تھے ان کو توڑ کر گرا دینے کا حکم دیا"۔ اور اس حکم پر فوری طور پر عمل کیا گیا۔ ابن ہشام نے فتح مکہ اور بتوں کو توڑنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان کا یہ بیان عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے کہ "فتح مکہ کے دن رسول ﷺ داخل شہر ہوئے تو آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ اس پر بیٹھے بیٹھے طواف کیا۔ بیت اللہ کے چاروں طرف سیسے سے جمے ہوئے بت نصب تھے۔ آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایک لکڑی تھی' اس سے بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے ﴿ جاء الحق وزهق الباطل' ان الباطل كان زهوقا ﴾ (حق آ گیا اور باطل چلا گیا اور بے شک باطل جانے اور زائل ہونے والا ہی تھا)۔ چنانچہ آپ جس بت کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے' وہ گدی کے بل اور جس کی گدی کی طرف اشارہ کرتے وہ چہرے کے بل خود بہ خود گرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی بھی بت باقی نہ رہا' سب گر گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان بت پرستوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ جم کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی' لیکن یہ لوگ زیادہ عرصہ متحد نہ رہ سکے' کیونکہ ان کے ہاں سینکڑوں قبیلے اپنے اپنے بتوں کے گرد جمع تھے' لہٰذا اس کا بڑا فائدہ مسلمانوں کو ہوا' حالانکہ ابرہہ کے حملے کے دوران بھی ان بت پرستوں نے خانہ کعبہ کو تو چھوڑ دیا تھا لیکن اپنے اپنے معبدوں میں مقابلے کے لئے تیار تھے۔ یہی بڑی کمزوری تھی جس کی بنا پر مسلمانوں کی تبلیغ کو یہ لوگ نہ روک سکے اور اسلام پھلتا پھولتا رہا۔ پھر یہ کہ عیسائی اور یہودی ان بت پرستوں کی پوری طرح مدد نہ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو بھی بت پرستی کی یہ شکل پسند نہ تھی جو عربوں نے اختیار کر لی تھی اور ایک دو کی جگہ سینکڑوں بت بنا لئے تھے۔

جب اہل طائف کو خانہ کعبہ کے بتوں کی پامالی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آنحضرت ﷺ "طاغیہ" یعنی لات کو ان کے لئے چھوڑ دیں اور اسے تین سال تک منہدم نہ کریں"۔ لیکن رسول اکرم ﷺ نے کسی بھی ایسے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا اور "ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ کو طاغیہ (لات کے بت کدے) کے انہدام کے لئے بھیجا"۔

بہرحال اہل طائف کے قبیلہ ثقیف کا بت لات بھی توڑ دیا گیا جس طرح دیگر بتوں یا قبوں کو ڈھا دیا گیا تھا۔

عزیٰ

عزیٰ لفظ عزیر سے لیا گیا ہے۔ گویا جس طرح عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا اسی طرح عزیٰ کو بیٹی بنا دیا گیا۔ لیکن اس بیٹی کی شکل بھی انسانی نہ تھی۔ علامہ ابن جریر الطبری نے اس کی شکل و صورت کے بارے میں مختلف اقوال تحریر کئے ہیں' مثلاً "مجاہد کے مطابق یہ کچھ درخت تھے"۔ سعید بن جبیر کے مطابق یہ ایک سفید پتھر تھا۔ ابن زید کے مطابق یہ طائف کا ایک مٹھ تھا۔ سعید بن جبیر اور ابن زید نے لات کا تطابق عزیٰ پر کیا ہے حالانکہ عزیٰ طائف میں نہیں تھا بلکہ وہاں لات تھا' پھر یہ کہ عزیٰ پتھر ہی نہیں تھا۔ بلکہ صحیح روایت مجاہد ہی کی ہے' کیونکہ تاریخی واقعات اور دیگر مصنفین کی رائے یہی ہے کہ "عزیٰ ایک کیکر (یا ببول) کا درخت تھا' جس کی قبیلہ غطفان پوجا کیا کرتا تھا"۔ ابن کثیر بھی یہی لکھتے ہیں کہ "مکے اور طائف کے درمیان نخلہ میں یہ ایک درخت تھا۔"

اس درخت کو پوجنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت عزیر علیہ السلام بخت نصر کی قید سے رہائی کے بعد جس درخت کے نیچے سوئے تھے۔ "اللہ تعالیٰ نے اسے ایک سو سال تک سویا ہی رکھا"۔ لہٰذا بخت نصر کی قید سے دیگر لوگ جو رہا ہوئے تھے وہ بھی بابل ہی میں قید تھے اور یہ علاقہ بت پرستی میں اپنی مثال آپ تھا' یہی وجہ تھی کہ اس درخت کو بھی مقدس خیال کیا جانے لگا اور باقاعدہ قبہ بنا لیا گیا اور چادریں چڑھائی جانے لگیں۔

یہی وہ عزیٰ تھی جس کی دوہائی ابوسفیان نے جنگ احد میں دی تھی۔ "لنا العزى ولا عزى لكم" (ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا نہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا "جواب دو الله مولانا ولا مولى لكم"۔ اللہ ہمارا والی ہے اور تمہارا والی کوئی نہیں۔

فتح مکہ کے بعد حضور اکرم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید کو عزیٰ کے ڈھانے کے لئے بھیجا۔ "عزیٰ تین ببول (یا کیکر) کے درختوں پر مشتمل ایک مٹھ یا قبہ کی شکل کا تھا' خالد بن ولید نے اسے ڈھا دیا اور واپس آ کر حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع دی

مومن کے نام پیغام

اس بحر تلاطم میں جینا تو اگر چاہے — اللہ پہ بھروسہ کر مانند چٹاں ہو جا
گر پیش نظر تیرے انساں کی بھلائی ہے — ہر بزم سماعت میں تو حق کی زباں ہو جا
ظلمت کے ٹھکانوں میں تو جلوہ نمائی کر — ہر راہ صداقت میں تو جلوہ فغاں ہو جا
ایماں کی حرارت سے ہے گرم تیرا سینہ — باطل کو مٹا دے تو اور میر زماں ہو جا

(از : ڈاکٹر دلاور عبدالرؤف' کراچی)

جس پر آپ نے فرمایا "تم نے کچھ نہیں کیا' لوٹ کر پھر دوبارہ جاؤ۔" گویا ابن کثیر کے مطابق حضرت خالد بن ولید دو دفعہ اس کو ڈھانے گئے' بلکہ عزیٰ کو قتل کرنے گئے۔ کیونکہ دوسری دفعہ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا "ایک ننگی عورت ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور اپنے سر پر مٹی ڈال رہی ہے' آپ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا اور واپس آ کر حضور ﷺ کو خبر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا عزیٰ یہی تھی"۔ ابن کثیر نے واقعات کو خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ دیگر تاریخوں سے ان کے بیان کی تائید نہیں ہوتی' پھر یہ کہ ایک عورت اتنے طویل عرصے تک یعنی حضرت عزیرؑ کے بعد سے حضور اکرم ﷺ کے عہد تک کس طرح زندہ رہ سکتی ہے۔ لہٰذا صحیح بیان ابن اثیر کا ہے جو اس طرح ہے کہ "جب خالد اس (عزیٰ) کے قریب پہنچے تو پجاری نے کہا اے عزیٰ! اپنے غصے اور غضب کو ظاہر کر۔ پس ایک سیاہ فام برہنہ عورت اس کے اندر سے چیختی چلاتی اور روتی ہوئی نکلی' خالد نے اس عورت کو قتل کر دیا اور بت توڑ ڈالا اور عمارت کو ڈھا دیا۔ واپس آ کر جب انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ اب اس عزیٰ کی پوجا کبھی نہیں ہوگی۔" چنانچہ آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

منات

یہ بت بھی اپنی قدامت میں کسی اور سے کم نہ تھا۔ پھر یہ کہ اس کے بارے میں عبرانی' عربی اور سنسکرت تین زبانوں میں ذکر موجود ہے' لیکن ہر جگہ معمولی سا تحریری اور مخرج کا فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک بت مختلف جگہوں پر مختلف اوقات میں منتقل ہوتا رہا۔ لہٰذا ہر علاقے کی جداگانہ زبان اور خاص کر طویل مدت نے اپنا اثر دکھایا۔ اہل بابل نے اس کو عبرانی زبان میں "بنات" کہا۔ سنسکرت میں نات یا "ناتھ" اور عرب میں "منات" لکھا گیا اور عرف عام میں بھی اسی طرح مشہور ہوا۔

شیخ فرید الدین عطار ہندوستان کے سومنات کے بارے میں کہتے ہیں۔ "سومنات مرکب ہے سوم اور نات سے' اور نات اس بت کا نام ہے جو بت خانے میں رکھا ہوا تھا"۔ فرشتہ کی رائے میں "سوم اس بادشاہ کا نام ہے جس نے اس بت کو بنایا تھا اور نات خود اس بت کا علم ہے"۔

فرشتہ کی رائے دراصل اسرائیلیات پر مبنی ہے اور درست بھی ہے' کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے یعنی بنی اسرائیل ہر پیغمبر کی تردید کر کے اپنے بتوں کو مانتے تھے۔ تمام بڑے بڑے علاقوں مثلاً مصر' شام' بابل اور اسور وغیرہ میں بت پرستی عام تھی اور اسی زمانے میں "شاہ اسور سلمنسر نے سامریہ پر چڑھائی کی اور اس کا محاصرہ کر لیا"۔ بالآخر فتح شاہ اسور کو ہوئی۔ حملے کی وجہ یہ تھی کہ مفتوح ہو سمیع اسرائیل جو سامریہ میں سلطنت کرتا تھا پہلے سے شاہ سلمنسر کا باج گزار تھا۔ لیکن ان دنوں جب کہ اس پر حملہ ہوا "اس نے شاہ مصر "سو" کے پاس ایلچی بھیجے تھے اور شاہ اسور کو ہدیہ نہ دیا جیسا وہ سال بہ سال دیتا تھا"۔ گویا سامریوں کے مصریوں سے اچھے تعلقات تھے۔ خواہ یہ تعلقات سیاسی ہوں یا مذہبی۔ لیکن جب سامریوں کو شاہ اسور نے قید کیا تو ان کی جگہ "شاہ اسور نے بابل اور کوتہ اور عوا اور حمات اور سفروائم کے لوگوں کو لا کر بنی اسرائیل کی جگہ سامریوں کے شہروں میں بسایا"۔ ان مختلف علاقوں کے لوگوں نے سامریہ کے طرز پر عبادت نہ کی جیسا کہ عہد نامہ عتیق میں لکھا ہے۔ لہٰذا "ہر قوم نے اپنے دیو تا بنائے اور ان کو سامریوں کے بنائے ہوئے اونچے مقاموں کے مندروں (پر) رکھا۔ ہر قوم نے اپنے شہر میں جہاں اس کی سکونت تھی ایسا ہی کیا سو بابلیوں نے سکات بنات کو اور کوتیوں نے سیرگل کو اور حماتیوں نے ایسما کو بنایا"۔ گویا اہل بابل کے معبود سکات بنات تھے۔ یہی بنات جب سامریہ میں لایا گیا تو اسے منات کے نام سے پکارا گیا۔ یاقوت نے اپنی تصنیف معجم البلدان میں سامریہ کی جگہ لفظ سامرہ استعمال کیا ہے۔ ان کے مطابق "سامرہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بستی" تھی جبکہ مشلل اور قدید کو بھی مکہ اور مدینہ کے درمیان بتایا جاتا ہے' جہاں منات کا بت نصب تھا۔

بہرحال جہاں تک بنات یا منات کا تعلق ہے' اس بارے میں یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ اس نام کو محفوظ کرنے میں اگر ایک طرف عبرانی زبان کا ہاتھ ہے تو دوسری طرف سنسکرت ادب کا بھی بڑا دخل ہے جس نے لفظ نات (ناتھ) کو محفوظ کیا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس زبان کے لوگوں نے اپنی زبان کو اور اپنے ادب کو دیگر زبانوں کی طرح خلط ملط نہیں ہونے دیا۔ ورنہ آج لوگ منات کی حقیقت سے آشنا نہ ہوتے۔

منات حجاز میں

اہل بابل کا بنات جب مکہ اور مدینہ کے درمیان سامرہ اور مشلل میں منتقل ہوا تو اسے منات کے نام سے پکارا گیا اور فتح مکہ تک قبیلہ خزاعہ' اوس اور خزرج کی عظمت کا نشان بنا رہا۔ لات و عزیٰ کے برعکس یہ بت انسانی شکل پر تراشا گیا تھا لیکن "عورت کی شکل میں تھا"۔ یاقوت اپنی تصنیف میں اس بت کے مقام تنصیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ مکے اور مدینے کے درمیان قدید کے ساحل بحر پر نصب تھا۔ جبکہ طبری اور ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ یہ قدید کے پاس مشلل یا (مشلشل) میں واقع تھا۔ ابن کثیر اور طبری نے ذرا سی غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک قدید ایک ضلع تھا جس میں یہ مشلل بھی شامل تھا حالانکہ مشلل کوئی ضلع نہ تھا بلکہ ایک پہاڑ تھا جو سمندر کے ساتھ ساتھ تھا اور اسی پہاڑ پر منات کا مندر تھا۔

منات مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع تھا لہٰذا لوگوں نے حدود حرم میں داخل ہونے کے لئے مشلل کو بھی حدود حرم بنا لیا تھا' یہی وجہ ہے کہ حج کو روانہ ہونے سے پہلے احرام یہیں سے باندھ کر روانہ ہوتے تھے۔ اسی لئے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ فرمایا "(اسلام سے پہلے) انصار منات کے لئے احرام باندھتے تھے"۔ گویا انصار مدینہ منورہ سے بغیر احرام باندھے نکلتے تھے اور ارادۂ حج منات کے سامنے یا مندر میں کرتے اور یہیں سے احرام باندھتے اس لئے یہ مقام حرم کی حدود متعین کرتا تھا۔

اسی طرح عزیٰ اور لات کے مقامات سے بھی احرام باندھ کر لوگ نکلتے اور خانہ کعبہ کی عزت و تعظیم بھی کرتے بلکہ مقام عبادت کعبتہ اللہ کو سمجھتے تھے۔

ان تینوں بتوں کے ماننے والے اور کعبے کے متولی دیگر علاقوں کے لوگوں اور دیگر ممالک کے باشندوں کو حج کا موقع فراہم کرنے کے لئے ایام حج میں لڑائی جھگڑوں سے باز آ جاتے تھے اور انہوں نے کعبہ اللہ سے لات' منات اور عزیٰ کے علاقے کو تین طرف سے حدود حرم قرار دے دیا تھا تاکہ لوگ بے خوف و خطر حج کر سکیں۔ یوں تو کعبے میں ایک بڑا بت ہبل تھا اور تین سو ساٹھ چھوٹے چھوٹے اور بت بھی موجود تھے' لیکن اس کے باوجود ان تین بتوں کی یہ اہمیت تھی کہ جب لوگ طواف کرتے تو یہ پڑھتے تھے "لات' عزیٰ اور تیسرا منات یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے"۔

بہرحال جس طرح فتح مکہ کے بعد لات اور عزیٰ کو توڑا گیا اسی طرح منات کو توڑنے کا حکم بھی دیا گیا'

لیکن منات کے توڑنے کی بابت مورخین اور مفسرین کی رائے میں اختلاف ہے۔ طبری اور ابن اثیر کے مطابق منات کو سعد بن زید الاشہلی نے توڑا۔ ابن اثیر کی رائے میں اسے توڑنے کے لئے آنحضرتؐ نے ابوسفیان کو بھیجا اور وہ اس کو ریزہ ریزہ کر آئے۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے یہ کفرستان فنا ہوا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو توڑ دیا تھا۔

منات کو توڑنے کے بارے میں زیادہ مواد نہیں ملتا' طبری نے صرف دو سطریں لکھی ہیں' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد بن زید الاشہلی نے منات کو توڑا تھا۔

اہل ہند اور منات

اگر یہ مان لیا جائے کہ عربوں کا منات سعد بن الاشہلی نے توڑا تھا تو چار سو سال بعد جس منات کے توڑنے کا انکشاف محمود غزنوی پر کیا گیا وہ کون سا تھا اور کس طرح پٹن یعنی سومنات میں لایا گیا۔

جہاں تک ہندی تاریخ کا تعلق ہے' اس کے مطابق یہ مندر نہایت قدیم ہے اور "یہ بت ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سری کرشن کے زمانے سے اسی جگہ تھا جس کو چار ہزار برس سے کچھ زیادہ ہوئے"۔ دوسری شہادتیں اس بارے میں جوناگڑھ کی غیر مطبوع تاریخی دستاویزات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے علاقوں سے منات کو چند عرب اٹھا کر لائے تھے۔

سب سے پہلے سری کرشن کے بارے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ وہی کرشن ہیں جن کے اپدیش بھگوت گیتا کی شکل میں آج بھی موجود ہیں' لیکن مورخین کو دو باتوں پر اعتراض ہے۔

اول یہ کہ سری کرشن کا زمانہ چار ہزار برس پرانا ہرگز نہیں بلکہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ قبل مسیح تک کے درمیان کا ہے۔

دوسری بات یہ کہ کرشن اس مقام پر کبھی نہیں آئے اور نہ مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں لڑی گئی۔ یہ بات صرف انکشاف پر مبنی نہیں بلکہ عراق اور ہندوستان کے ٹھوس تاریخی اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہے جو لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب نے اپنی تصنیف "معارف آلاثار" میں جمع کئے ہیں۔ ان کے مطابق "مہابھارت کی جنگ ہندوستان میں نہیں بلکہ شمال مغربی عراق میں اربیلا کے میدان میں ہوئی۔ یہ میدان کردستان کی سرحد پر واقع ہے اور درحقیقت یہی میدان کورو کشیترا ہے۔"

ان دلائل کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موجودہ کرد قوم ہی کورو ہیں' گویا سری کرشن درحقیقت عراق سے متعلق ہیں اور یہیں سے یہ آریائی ہندوستان پہنچے جہاں انہوں نے اپنی رزمیہ داستانوں کو قلم بند کیا۔ بالفاظ دیگر مذہبی و تاریخی واقعات عراقی تھے تو زبان ہندوستانی تھی اور اسی زبان کی بدولت عراقی دیوتا بھی ہندوستان کے دیوتا بن گئے۔

سومنات کی تعظیم

ہندو اس مندر کی تعظیم اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کے نزدیک کرشن نے یہیں روپوشی اختیار کی تھی۔ پھر یہ کہ "ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ روحیں بدن سے جدا ہونے کے بعد سومنات ہی میں آکر جمع ہو جاتی ہیں' سومنات انہیں جس جس بدن میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے"۔ دوسری عقیدت ان کی سمندر کے اس پانی کے بارے میں تھی جو سومنات کے مندر سے ٹکراتا تھا جس کے متعلق ان کے رائے یہ تھی کہ "سمندر اس بت کے قدم چومنے کے لئے آتا ہے"۔ کیونکہ یہی مہادیوی تسلیم کی گئی تھی۔

اسی عقیدت مندی کی بنا پر راجے اور امراء "اپنی بیٹیوں کو سومنات کی خدمت کے لئے نذر بت خانہ کر دیتے تھے اور یہ لڑکیاں تمام عمر ناکتخدا رہ کر بت خانے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔" اس لئے کہ اس بت خانے میں بے شمار لوگ نہ صرف زیارت کے لئے آتے تھے بلکہ اس بت خانے کے خادمین میں سینکڑوں ایسے افراد شامل تھے جن کے اخراجات کا داروہدار دیہات سے وصول شدہ رقوم پر تھا۔ فرشتہ کے مطابق "بت خانے کی تباہی کے وقت تقریباً دو ہزار قصبوں کی آمدنی اس کے اخراجات کے لئے وقف تھی"۔ یہ دیہات لوگوں نے منات کے مندر کے لئے وقف کئے تھے۔ اسی لئے "پانچ سو گانے بجانے والیاں اور تین سو مرد سازندے بت خانے کے ملازم تھے اور تین سو حجام یاتریوں کے سر اور داڑھی مونڈھنے کے لئے بروقت موجود رہتے تھے"۔

جب اس بت سے راجاؤں کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا تو عوام الناس کے جذبہ عقیدت کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی بڑی تعداد میں زیارت کی غرض سے آتے تھے۔ اس کے لئے صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ "دو ہزار برہمن ہر وقت بت خانے کی پرستش کے لئے موجود رہتے تھے"۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں عوام کی کثرت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے۔ "جب کبھی چاند یا سورج گرہن ہوتا تو تقریباً دو لاکھ تیس ہزار آدمی سومنات کے بت خانے میں جمع ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بہ ظاہر یہ بات قابل یقین معلوم نہیں ہوتی لیکن ابن خلدون کا وہ بیان جو اس نے اس بت خانے کی وسعت کے بارے میں دیا ہے اس کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "بت خانے کی عمارت نہایت عظیم الشان اور وسیع تھی' چھپن مرصع ستونوں پر وہ عمارت قائم تھی۔" لہٰذا ایسی وسیع و عریض عمارت میں دو لاکھ آدمیوں کا سما جانا مشکل نہیں ہوگا۔

بت خانے کے جواہرات اور سونا

عبادت گزار لوگوں کو بلانے کے لئے اس مندر میں "بت کے قریب طلائی زنجیر میں ایک سو من وزن کا گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔" سونے کی یہ دو سو من کی زنجیر بت خانے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک باندھ رکھی تھی۔ لہٰذا اس عظیم الشان ہال کی لمبائی یا چوڑائی سے زنجیر کی لمبائی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ زین المآثر میں لکھا ہے کہ بت خانے کی وہ خاص جگہ جہاں سومنات رکھا ہوا تھا' بالکل تاریک تھی اور جو روشنی وہاں پھیلی ہوئی تھی وہ ان گراں بہا جواہرات کی شعاعیں تھیں جو بت خانے کی قندیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔ اسی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ سومنات کے خزانے سے اس قدر چھوٹے چھوٹے بت سونے اور چاندی کے برآمد ہوئے کہ ان کی قیمت کا اندازہ لگانا تقریباً محال ہے' چنانچہ حکیم ثنائی فرماتے ہیں۔

کعبہ و سومنات چوں افلاک
شدز محمود و از محمد پاک
ایں زکعبہ بتاں بروں انداختہ
آں زکیں سومنات را پر داختہ

ابن خلدون اس بت خانے کے دھن و دولت کی بابت لکھتا ہے' "بت کدہ کے دروازے پر زرہفت کے پردے پڑے تھے' جن کی جھالروں میں موتی اور جواہر لٹکے ہوئے تھے' ان میں سے ہر ایک کی قیمت بیس بیس ہزار دینار تھی"۔

لیکن مندر میں آنے والے عقیدت مند سونے' چاندی اور جواہرات سے بے نیاز ہو کر ایک پتھر کے تراشے ہوئے بت کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ اس بت کے بارے میں "تاریخ خیرات" اور تاریخ ابن خلدون میں یہ تحریر ہے کہ "سومنات کا بت پتھر تراش کر بنایا گیا جو پانچ گز لمبا اور تین گز چوڑا تھا' جب

کہ فرشتہ لکھتا ہے کہ "یہ بت دو گز زمین میں گڑا ہوا تھا اور تین گز باہر تھا"۔

تاریخ کی مذکورہ بالا کتابیں فتح سومنات کے بہت بعد لکھی گئیں' لہٰذا اصل واقعات سامنے لانے کے بجائے افسانہ نگاری کر کے ہندی فن تعمیر کو بدنام کیا گیا اور فتح سومنات کی اصل وجہ کو پس منظر میں لے گئے تاکہ عربوں کے منات کی اصل حقیقت سے لوگ روشناس نہ ہوں' اسی طرح ہندی مورخین نے بھی محمود غزنوی پر الزامات لگانے کی خاطر سومنات کی دولت کو حملے کی وجہ بتایا ہے' حالانکہ اس سومنات سے زیادہ مال و دولت اسے متھرا کے بت خانے سے ملا تھا۔ یہ بات محمود کے عہد کا مورخ یمینی لکھتا ہے کہ "ان بت خانوں میں پانچ سونے کے بت تھے جو پانچ گز کے تھے اور ہوا میں معلق تھے' ان کی آنکھ میں یاقوت جڑے ہوئے تھے انہوں نے (ہندوؤں نے) یہ ترکیب کی تھی کہ اگر سلطان ان کو بازار میں بیچنا چاہے تو ان کی قیمت پچاس ہزار دینار سے زیادہ ملے اور اسے کوئی بھی بہ رضا و رغبت خرید لے۔ دوسرے بت میں ایک ٹکڑا یاقوت کا جڑا ہوا تھا جو چمک دار اور بیش بہا قیمت کا یاقوت تھا' جس کا وزن چار سو پچاس مثقال تھا۔ سونا اور چاندی کے بت اس کے علاوہ تھے' جن کا موازنہ پرانے وزن سے کیا جا سکتا ہے"۔

سب سے زیادہ مال و دولت اسی حملے سے سلطان کے ہاتھ آیا تھا۔ یمینی نے اپنی تصنیف میں صرف جواہرات کے وزن بیان کئے ہیں جب کہ سجان رائے اپنی تصنیف میں لکھتا ہے "جب مال غنیمت سمیٹا تو اس میں سونے کا وہ بت بھی تھا جو وزن کرنے پر اٹھانوے ہزار تین سو مثقال پختہ (نو من چوبیس سیر) کا تھا۔ اس کے علاوہ پانچ لاکھ بیس ہزار درم' ترپن ہزار غلام اور تین سو پچاس ہاتھی بھی تھے"۔

سومنات میں کوئی بھی قابل ذکر سونے چاندی کا بت نہ تھا جس کا کہ وزن کیا جاتا بلکہ خود منات بھی مقناطیسی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اسی لئے بعض لوگ اسے لوہے کا یا مقناطیس کا خیال کرتے تھے کیونکہ یہ ہوا میں معلق تھا' اور جب اس کے معلق ہونے کے بارے میں محمود غزنوی نے رائے لی تو ایک عقل مند شخص نے کہا "میرے خیال میں یہ بت خانہ مقناطیس کا بنا ہوا ہے اور بت لوہے کا ہے۔ اس کے بنانے والے کی کاری گری ہے کہ اس کو ہر طرف سے مقناطیس اپنی طرف کھینچے ہوئے ہے' جس کی وجہ سے ہر طرف سے یہ بت ایک طرف سے دوسری طرف اور اوپر سے نیچے نہیں ہو سکتا لہٰذا بیچ میں کھڑا ہوا ہے"۔ ایک گروہ اس نظریے کی تائید میں تھا اور دوسرا مخالفت میں' ان میں سے ایک شخص نے سلطان سے کہا کہ آپ مجھے حکم دیں کہ دو پتھر بت کے سر سے ہٹا دوں تاکہ بھید آشکار ہو جائے۔ بادشاہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا' جب دو پتھر ہٹائے گئے تو بت ٹیڑھا ہو گیا اور ایک طرف جھک گیا۔ اس طرح پتھروں کو ہٹا ہٹا کر بت کو نیچے لے آئے یہاں تک کہ وہ زمین سے ٹک گیا۔

اگرچہ یہ حوالہ بیہقی کی تصنیف سے لیا گیا ہے لیکن اس بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اصل تصنیف مٹ چکی ہے اور حوالوں کی مدد سے ایرانی حکومت نے اس کو شائع کرایا تھا۔ لیکن خاص بات جو اس حوالے میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بت ہوا میں معلق تھا اور سلطان خود حیران تھا' حالانکہ سلطان کا حملہ سومنات تقریباً آخری حملہ تھا اور اس سے قبل اس کے کئی حملے ہندوستان پر ہو چکے تھے اور ان حملوں میں یہ ناممکن ہے کہ اس نے اس طرح کے بت جو ہوا میں معلق تھے نہ دیکھے ہوں' کیوں کہ جابجا ایسے بت خانے بنے ہوئے تھے۔ محمود کے حملوں سے پچاس برس قبل مرتب کی جانے والی کتاب "الفہرست" میں محمد بن اسحاق بن ندیم لکھتے ہیں۔ "ایک بت خانہ ملتان میں ہے' کہتے ہیں' یہ سات بڑے بت خانوں میں سے ایک ہے' اس میں لوہے کا سات ہاتھ لمبا ایک بت ہے' جو گنبد کے وسط میں واقع ہے۔ اس بت کو تمام اطراف سے یکساں طور پر سنگ مقناطیس نے گھیر اور روک رکھا ہے۔" لہٰذا ایسے مستند حوالے کے ہوتے ہوئے اور یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ محمود غزنوی نے ملتان پر کئی دفعہ فوج کشی کی تھی اور آخر میں سومنات میں داخل ہوا تھا تو ایسی صورت میں اس بات کا کوئی جواز نہیں رہتا کہ محمود سومنات کے مندر میں بت کو دیکھ کر حیران و پریشان ہوا ہو' اور نہ سومنات کی دولت اسے وہاں لے کر گئی تھی' کیونکہ مہانگر کا بت خانہ اس سے زیادہ مال و زر کا مالک تھا' جس میں بیس ہزار بدھ کے مجسمے تھے اور ابن ندیم کے زمانے میں بھی یہ بت خانہ قائم تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔" (بیس ہزار بدھ کے مجسمے) جو گوناگوں اور قیمتی جواہر مثلاً سونا' چاندی' لوہا' پیتل' ہاتھی دانت وغیرہ سے مرصع ہیں" اسی طرح ایک اور بت خانہ جو مکران و قندھار کے قریب واقع تھا' اس بت کے بارے جو یہاں رکھا ہوا تھا' ابن ندیم لکھتے ہیں۔ "وہ سونے سے بنا ہوا ہے' اس کا طول و عرض سات سات ہاتھ اور بلندی بارہ ہاتھ ہے' گوناگوں جواہر سے مرصع ہے۔ اس کے بت یاقوت احمر اور موتیوں سے مرصع شان دار قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک ایک موتی چڑیا کے انڈے کے برابر یا اس سے بھی بڑا ہے"۔

الفہرست کے مستند حوالوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمود کے مرنے کے بعد سومنات کی فتح کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ یہ سب مسلمان حملہ آوروں کے قدم جمانے کے لئے بعد کے مسلمان سلاطین کے زمانے میں دانستہ طور پر کیا گیا' اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ مال غنیمت کے لالچ میں زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوں۔

درحقیقت محمود غزنوی کے حملے کی غرض و غایت صرف یہ تھی کہ منات کے بت کو پامال کیا جائے' اسی لئے اس نے اس بت کو سومنات کے مندر میں نہیں توڑا اور نہ چلایا بلکہ اپنے ساتھ لے آیا۔ اس رائے کا اظہار منہاج سراج نے اپنی تصنیف "طبقات ناصری" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "سومنات سے منات کا بت (غزنی) لے آیا اور اس کے چار ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا غزنہ کی مسجد جامع میں رکھا' دوسرا سلطان کے محل میں' باقی دو ٹکڑے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیج دیئے گئے" یہ بات صرف منہاج سراج ہی نے نہیں لکھی بلکہ سومنات کے واقع کے ارسٹھ سال بعد ۴۸۴ھ میں نظام الملک طوسی نے اپنی تصنیف "سیاست نامہ" میں بھی اس واقعے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ محمود کے بارے میں لکھتے ہیں"۔ وہ ہندوستان میں اتنی دور گیا کہ سومنات تک لے لیا اور منات اپنے ساتھ لے آیا"۔

ان مستند تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ محمود نے منات کو سومنات میں نہیں توڑا اور نہ اسے اس مندر کی دولت کی ضرورت تھی۔ پھر یہ کہ اس سے زیادہ سونے چاندی سے بھرے ہوئے مندر دیگر علاقوں میں بھی تھے جو غزنی سے زیادہ قریب تھے' اس لئے اس مختصر مضمون میں عام مندروں کی دولت کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام اس سلسلے میں خود کوئی فیصلہ کر سکیں۔OO

☆☆

نامے میرے نام...

ہفت روزہ "ندائے خلافت" میں حدیث امروز کے کالم میں پاکستان میں جو عوامل ہمیں زوال کے جانب دھکیل رہے ہیں اور عذاب شدید کی نوید سنا رہے ہیں ان کی نشاندہی کی جارہی ہے تاکہ عوام کو آگاہ کیا جاسکے اور اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے یا جو لوگ ملک و ملت کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش ہیں ان کو بے نقاب کیا جائے یا جن طریقوں سے ملک کو لوٹا جارہا ہے اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔

میرا تعلق محکمہ تعلیم سے ہے۔ میں ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ چکا ہوں اور شاید جلد ہی خود ریٹائرمنٹ لے لوں۔ میں نے محکمہ تعلیم کے ہر شعبہ میں کام کیا ہے۔ بہت سا وقت انتظامی امور میں گزرا ہے اور تدریسی کام بھی کافی عرصہ کیا ہے۔ اس وقت محکمہ تعلیم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جارہا ہے۔ دوسرے محکمہ جات پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے بارے مجھے بھی اتنا علم ہے جتنا کہ دوسرے لوگوں کو ہے۔

گزشتہ کئی سالوں سے اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے والے سیاستدان خصوصاً ایم۔ پی۔ اے' ایم۔ این۔ اے مشیر مملکت اور وزراء تعلیم پر خصوصی توجہ دینے لگے ہیں۔ انہیں نونہالان ملت کی تعلیم سے زیادہ تعلیمی ادارے بنانے کا شوق ہے۔ اگر بستی کے شرقی کونہ میں ایک پرائمری سکول ہے تو غربی کونے میں ایک سکول کھلوانے کے خواہشمند ہیں۔ اگر بستی میں گرلز پرائمری سکول نہیں ہے تو اس کے لئے کوشاں ہیں۔ اگر پرائمری سکول موجود ہے تو اسے مڈل کا درجہ دلوا رہے ہیں اور مڈل کو ہائی کا اور ہائی کو ہائر سیکنڈری سکول بنوانے کی کوشش ہے۔ دیکھنے کو تو یہ خوش آئند بات ہے لیکن اس کا مقصد عوام میں تعلیم کو عام کرنا نہیں جیسا کہ اخبارات اور اسمبلی کے پلیٹ فارم سے اظہار کیا جاتا ہے کہ شرح خواندگی میں اضافہ کیا جارہا ہے۔

سکول کا اجراء یا اپ گریڈ کرانے کے لئے جو رقم حاصل کی جاتی ہے وہ عموماً تین چار گنا زیادہ ہوتی ہے خصوصاً دیہی علاقہ میں تو جتنا خرچ کردیا جائے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تعمیری میٹریل کی ترسیل کے ذرائع بہتر ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی تاثر یہی دیا جاتا ہے کہ دیہی علاقہ میں تعمیری کام سرانجام دینا بہت مشکل ہے۔ تعمیر کے لئے رقم منظور کرانے والے شخص کی چاندی ہے۔ اس کا حصہ اسے گھر بیٹھے مل جاتا ہے۔ باقی رہی کاغذی کارروائی وہ محکمہ مکمل کرتا ہے۔ سیکنڈری سکول کا درجہ دیا جائے تو وارے نیارے ہیں اس پر پچاس ساٹھ لاکھ تو کوئی بات نہیں" لہٰذا اب سیاستدان ہائر سیکنڈری سکول بنوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پرائمری سکول کو ڈائریکٹ ہائر سیکنڈری سکول بنوا دیتے ہیں۔ بعض پرائمری مدارس کو کھلے ایک یا دو سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا انہیں ہائر سیکنڈری سکول کا درجہ دے دیا ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہاں طلبہ یا طالبات اتنی تعداد میں مل بھی جائیں گے۔ انہیں تو عمارت تعمیر کرانے سے غرض ہے۔ جہاں سکول آبادی میں واقع ہیں اور نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں لیکن وہاں چونکہ رقبہ کی فراہمی ایک مسئلہ ہوتا ہے لہٰذا عام طور پر ایسے سکولوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے جہاں رقبہ مفت مل جائے یا اس کے اردگرد سرکاری رقبہ ہو یا غیرآباد رقبہ موجود ہو۔ رقبہ خرید کرنا پڑتا ہے تو اس میں گرانٹ منظور کرانے والے کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا وہاں مزید عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

اب ایک نیا سلسلہ چل نکلا ہے۔ سکول کی عمارت اپنے رقبہ میں اور اپنے ڈیرہ کے قریب تعمیر کرائی جاتی ہے۔ اپنے ڈیرہ کے قریب سکول کی عمارت ڈیرہ کا حصہ بن جاتی ہے سکول کے بچے درختوں یا سکول کی عمارت کے سایہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ سکول کی عمارت مہمان خانہ بنی ہوئی ہوتی ہے یا سٹور کا کام دیتی ہے۔ دوسری صورت میں مزارع کی رہائش گاہ کا کام دیتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ سکول میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ نہ ہو۔ چند ایک طلبہ کو دکھانا مقصود ہے۔ استاد صاحب ان کے منشی کا کام دیتا ہے۔

پرائمری مدارس کے خصوصاً اور ہائی مدارس کے عموماً اساتذہ ڈیرہ داری کا کام دیتے ہیں۔ زیادہ پرائمری سکول کھلوانے سے ہر روز پورے علاقہ سے تفصیل سے خبریں موصول ہوتی ہیں کیونکہ سکول مدرس کا فرض ہے کہ علاقہ کی رپورٹ بروقت پہنچائے چونکہ اس کا رابطہ بچوں کی معرفت لوگوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ ہر شخص کی کیفیات کا اندازہ لگا کر وڈیرہ کو مطلع رکھتا ہے کہ کوئی شخص وڈیرہ کے حلقہ اثر سے باہر تو نہیں جارہا۔ اگر ایسا ہو تو اس کی گوشمالی وقت پر کی جائے۔ یہ اساتذہ ان کے مزارع کی طرح ہیں اگر وہ ان کا حکم نہ بجالائیں تو ان کے تبادلہ جات کردیئے جاتے ہیں اور انہیں افسران محکمہ تعلیم سے سزا دلوائی جاتی ہے۔ (محمد سلیم)

مکری میں آپ کے موقر جریدہ کی وساطت سے اپنی آواز وزیر اطلاعات تک پہنچانا چاہتی ہوں کہ ٹی وی موجودہ زمانے کی ایک اہم ترین ایجاد ہے لیکن اس کو غلط استعمال کیا جارہا ہے۔ کوئی پروگرام ایسا نہیں جو طبیعت میں ہیجانی کیفیت پیدا نہ کرتا ہو۔ ہر پروگرام میں بے ہنگم میوزک اور گانے شامل ہوتے ہیں جس سے نوجوان نسل کے اندر احساس ذمہ داری کا زیاں ہو رہا ہے۔ میں آپ سے اپیل کرتی ہوں کہ ٹی وی کا استعمال قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق کیا جائے اور فحش اور بے ہودہ پروگرام

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

سربراہ مملکت کے نام!

جناب آئی۔ ای بھاوانی کہتے ہیں "یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت نے باقاعدہ سنسر کرنے کے بعد سرکاری طور پر ملک میں ایسی فحش اور جنسی وڈیو فلموں کی اجازت دے رکھی ہے جن کی بھارتی حکومت بھی اپنے ملک میں اجازت نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ خود مغربی ممالک میں ایسی فلموں پر کنٹرول ہے اگر نہیں ہے تو اس مملکت خداداد پاکستان میں نہیں ہے۔

ارشاد ربانی ہے کہ اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ کیا اس ملک کے سربراہ آخرت میں اللہ کے ہاں جواب دہ نہیں ہوں گے کہ وہ بدی کو روکنے پر قادر تھے مگر انہوں نے اپنا یہ فرض ادا نہ کیا"۔ (دی مسلم ورلڈ)

ٹی وی خبرنامہ' وزراء کی سرگرمیوں کا بلیٹن بن کر رہ گیا ہے

ہمارے ملک کی باشعور آبادی اخبارات و جرائد پر انحصار کرنے پر مجبور ہے

حکومت نے پریس کو اپنی "اوقات" یاد دلانے کے لئے مستقل طور پر "آئینہ دکھانے" کا انتظام کر رکھا ہے

مولانا سید وصی مظہر ندوی

پاکستان میں اخبارات و جرائد یا پرنٹ میڈیا خاصا طاقتور ہو چکا ہے۔ جمہور کے ساتھ ان کا رابطہ بہت قوی' بہت گہرا اور بہت قریبی ہے۔ ملک کے لاکھوں تعلیم یافتہ شہری اور ان کے توسط سے مستفید ہونے والے مزید لاکھوں غیر تعلیم یافتہ اہل وطن صبح کے وقت تازہ اخبارات کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور اپنی ملازمت یا کاروبار پر جانے کی سرگرم تیاری' بچوں کو تیار کر کے اسکول پہنچانے کی ذمہ داری اور گھر کے لئے سبزی ترکاری لانے کی شدید بھاگ دوڑ میں اخباروں کی اہم خبروں پر جلدی جلدی نظر ڈالنا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں پھر ہر شخص اپنی اپنی مشغولیات کی نوعیت کے مطابق ملازمت یا کاروبار پر پہنچ کر یا سہ پہر گھر واپس آ کر یا رات کو سونے سے قبل اخبارات کا قدرے تفصیلی مطالعہ کرتا ہے۔

ملکی اور بین الاقوامی حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کے لئے ہمارے ملک کی باشعور آبادی اخبارات و جرائد پر انحصار کرنے پر اس لئے اور بھی مجبور ہے کہ حکومت خواہ کسی کی بھی ہو وہ ریڈیو اور ٹی وی کی آزادی کو بہرحال گوارا نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ ہمارے عوام ان قومی اداروں کے خبرنامے کو "وزیر نامہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وزراء کی سرگرمیوں کے خصوصی بلیٹن کی سی بن گئی ہے۔

اسی وجہ سے بہت سے محب وطن پاکستانی بی بی سی کے زہرناک پروپیگنڈے کو جانتے ہوئے بھی بی بی سی کی خبریں سنتے ہیں پھر انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے یا ڈش انٹینا کی سہولتوں سے لیس نہ ہونے کے باعث دنیا کے دیگر خبر رساں اداروں سے بھی وہ عام طور پر بھرپور استفادہ نہیں کر پاتے۔

ان حالات میں پاکستان کے عوام کی سیاسی تربیت اور قومی مسائل میں دلچسپی اور عالمی رجحانات و حالات کا شعور پیدا کرنے کا واحد ذریعہ زیادہ تر اردو جرائد و اخبارات ہیں اگرچہ اب انگریزی اخبارات سے مستفید ہونے والو کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہو چکا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت اخبارات کی قیمت ایک آنے سے دو آنے تک تھی مگر اب یہ قیمت بڑھتے بڑھتے دس روپیہ یا اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اخبارات کی قیمت میں (۶۰ گنا) اضافہ عوام کی قوت خرید میں اضافے سے لگا نہیں کھاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد میں کئی گنا اضافے اور سیاسی شعور سے بہرہ مند عوام کی تعداد میں غیر معمولی وسعت کے باوجود اخبارات کی تعداد اشاعت میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ دیکھا یہ جا رہا ہے کہ پہلے جو لوگ روزانہ ۳ یا ۴ اخبارات خریدتے تھے وہ اب بالعموم ایک اخبار خریدنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

> "حکومت پریس کو اپنا مستقل دشمن سمجھتی ہے اور اسی لئے اس نے پریس کو اپنی "اوقات" یاد دلانے اور اس کو اپنے "جامے" میں رکھنے کے لئے مستقل طور پر "آئینہ دکھانے" کا انتظام کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ پریس کی طرف سے سنگین ترین حقائق کی نقاب کشائی کے باوجود حکومت کے "استحکام" پر آنچ نہیں آتی"

اخبارات کی قیمت اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو اس کا ایک نقصان یہ ہو گا کہ عوام کی سیاسی تربیت کا عمل رک جائے گا یا کم از کم محدود ہو جائے گا۔ دوسرا نقصان یہ ہو گا کہ پریس کی طاقت اور قوت کم ہوتی چلی جائے گی اس طرح ہمارے آمریت پسند حکمران جو دیہی آبادی کو اپنا یرغمال بنا کر داد حکمرانی دیتے چلے آ رہے ہیں وہ پریس کے خوف سے بالکل آزاد ہو کر اور بھی زیادہ کھل کھیلیں گے۔

اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو موخر الذکر صورتحال تو عملاً پیدا ہو بھی چکی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت ملک کا پریس بحیثیت مجموعی موجودہ حکومت کے سخت خلاف ہے' حکومت کو بھی پریس کے نقطہ نظر کا علم ہے چنانچہ وہ پریس کو اپنا مستقل دشمن سمجھتی ہے اور اسی لئے اس نے پریس کو اپنی "اوقات" یاد دلانے اور اس کو اپنے "جامے" میں رکھنے کے لئے مستقل طور پر "آئینہ دکھانے" کا انتظام کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ پریس کی طرف سے سنگین ترین حقائق کی نقاب کشائی کے باوجود حکومت کے "استحکام" پر آنچ نہیں آتی۔

ان حالات میں اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اخبارات و جرائد کو اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ کوئی بھی حکومت ان کی آواز کو نظرانداز نہ کر سکے ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ اخبارات کا حلقہ اشاعت وسیع سے وسیع تر کیا جائے اور حلقہ اشاعت میں اس توسیع کے لئے ضروری ہے کہ اخبارات کی قیمت بالعموم عوام کی قوت خرید کے اندر ہو۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے اس دور میں اخبارات کی قیمت کو حد اعتدال میں

رکھنے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ میں آتا کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہنے کی خواہشمند عوام پر دیگر "معلومات" کو جبری طور پر مسلط کرنے کا سلسلہ ختم کر کے تمام جرائد و اخبارات اپنے خبری حصہ سے بالکل علیحدہ درج ذیل عنوانات یا اس جیسے مزید عنوانات کے تحت سہ روزہ' ہفت روزہ یا ماہانہ مجلات شائع کریں تا کہ جو لوگ ان عنوانات اور موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان مجلات و رسائل کو حاصل کریں مگر عام اخبار بین طبقہ ان موضوعات پر معلومات کی قیمت ادا کرنے کا جبری طور پر پابند نہ ہو۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے کہ اخبار بین طبقے کا بڑا حصہ اخبار کے زیادہ تر صفحات کو ردی میں بیچنے کے لئے ڈال دیتا ہے اگرچہ وہ اس کی بھاری قیمت ادا کر چکا ہوتا ہے۔ مجوزہ موضوعات یہ ہیں :

کھیل اور ثقافت

اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کا حلقہ خاصا ہے چنانچہ خاص اس موضوع پر جو معیاری رسائل شائع ہوں گے ان کی مقبولیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

ادب اور فنون لطیفہ

اس موضوع پر شائع ہونے والے مجلات میں کہانی' افسانے' شعر و شاعری' خطاطی اور مصوری وغیرہ کے بارے میں قابل قدر مواد شائع کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے مجلات میں شکاریات' سیاحت اور سائنس فکشن بھی شامل کئے جا سکتے ہیں اور مسلسل ناول بھی۔

فلم' ڈھاے اور اسٹیج شو

ظاہر ہے کہ اخبار کا ہر قاری ان امور سے دلچسپی نہیں رکھتا' بلکہ اخبارات کے بعض قاری تو اخبارات میں شامل فلمی ایڈیشنوں کو اپنے گھروں میں لے جانا بھی پسند نہیں کرتے چنانچہ میں نے دیکھا ہے کہ بسوں اور ٹرینوں میں اخبار خریدنے والے بعض حضرات اخبار خریدتے ہی اس کے فلمی صفحات کو چاک کر کے باہر پھینک دیتے ہیں کہ وہ اپنی گرہ سے پیسہ خرچ کر کے اپنے ساتھی مسافروں یا اہل خانہ کو "فلم کی دنیا" سے "مستفید" کرنے کے "کار خیر" میں آخر کیوں حصہ لیں؟

اگر ہمارے روزناموں سے ان موضوعات کا بوجھ اتار دیا جائے تو یہ اخبارات محض ۶ یا ۸ صفحات میں عام باشندگان ملک کو

۱) ملکی اور بین الاقوامی خبریں
۲) خبروں کا پس منظر
۳) ہلکے پھلکے فکاہی کالم اور
۴) ادارتی تبصروں سے مستفید کر سکتے ہیں۔

جن کی قیمت ۲ سے ۴ روپیہ تک ہو سکتی ہے۔ عوام کی اس ضرورت کے پیش نظر کراچی میں شام کے کئی اخبارات جاری کئے گئے اور مقبول بھی ہوئے لیکن یہ اخبارات بدقسمتی سے پنواڑیوں کی دکانوں پر بیٹھنے والے لوگوں کے ذہنی معیار سے آگے نہ بڑھ سکے نہ انہوں نے تازہ خبریں فراہم کرنے کا اپنا انتظام کیا بلکہ زیادہ تر صبح کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں ہی کو چٹخارے دار سرخیوں اور نمک مرچ لگا کر شائع کرنے کو اپنی مقبولیت کا راز سمجھا۔ اس لئے یہ اخبارات' افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے' عوام کے معیار اور ذوق کو بلند تو کیا کرتے اور پستی میں لے جانے کا سبب بنے۔ میرے خیال میں اس وقت ملک کے اندر ایسے اخباروں کی شدید ضرورت ہے۔ جو تمام خبر ایجنسیوں اور خود اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے حاصل کردہ تازہ ترین خبروں پر مشتمل ہوں۔

خبروں کی اشاعت کی حد تک بالکل غیر جانبدار ہوں۔ ہر خبر کو اس کی اپنی اہمیت کے لحاظ سے جگہ دیں اور خبروں کی سرخیوں میں خود اپنے نقطہ نظر کو داخل کرنے کی کوئی کوشش نہ کریں۔

ادارتی صفحہ پر البتہ اخبار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق خبروں پر تبصرہ کرے اور اس طرح عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔

اشتہارات کے سلسلہ میں قانونی اور اخلاقی پابندیوں کے علاوہ بزرگ صحافی مولانا اسماعیل ذبیح کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے تھے کم از کم پہلا ورنہ پہلا اور آخری صفحہ خریداروں کے حق خالص کے طور پر محض خبروں کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ان پر کوئی اشتہار نہیں ہونا چاہئے۔

آخر میں تجویز ہے کہ نظریاتی اخبارات نیز اخبارات کے عام خریداروں کو اخبارات میں مندرجہ بالا اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنی چاہئے چنانچہ ہر شہر میں اخبارات کے خریداروں کی تنظیمیں قائم کر کے ان کے پلیٹ فارم سے ان اصلاحات کے لئے پرزور آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہی آواز اخبارات کو خریداروں کا استحصال کرنے سے روک سکتی ہے اور ملک کے اخبارات کے حلقہ اشاعت کو وسیع کر سکتی ہے۔ پھر یہ طاقتور پریس حکومت اور سیاسی جماعتوں کو "لچھن" درست کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

غزل

اختر حافظ آبادی

کماں ابرو کی ہے معلوم کچھ تاثیر ہم کو بھی
کہانی میں لگا تھا ناگہاں اک تیر ہم کو بھی
زمانہ حرص کے صحراؤں میں حیران و سرگرداں
غم جاناں نے رکھا عمر بھر دلگیر ہم کو بھی
عجب اک شہر کیف انگیز کے موسم ہیں پاکیزہ
کسی دن تو وہاں لے جائے گی تقدیر ہم کو بھی
تقدس کا بھرم ملحوظ خاطر کچھ تو رکھئے گا
کہ مانند عرب ہے وادی کشمیر ہم کو بھی
کبوتر کی طرح کیا سوچتا یوں موند کر آنکھیں
اٹھانی ہی پڑے گی چوم کر شمشیر ہم کو بھی
خدایا جگنوؤں کی بارشیں اغیار پر کب تک
عطا ہو تیرگی میں رہنما تنویر ہم کو بھی
صلہ کچھ تو میسر آبلہ پائی کا ہو اختر
پرے منزل سے کیا لے جا رہے ہیں میر ہم کو بھی

بنگلہ دیش۔ ایک پسماندہ ملک !!!

بنگلہ دیش پارلیمنٹ کے رکن ظہیر احمد فرید نے (جو آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں) کہا ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی سیاست میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے ارکان اسمبلی پجارو پر سفر کرتے ہیں لیکن بنگلہ دیش کے اکثر ارکان اسمبلی سائیکل پر اجلاس اٹینڈ کرنے آتے ہیں۔ پاکستان میں ان پڑھ وزیر بن جاتا ہے لیکن بنگلہ دیش میں صرف گریجویٹ ہی الیکشن میں حصہ لے سکتا ہے۔ وہاں کا وزیر اعظم ہاؤس تین بیڈ رومز تک محدود ہے جبکہ آپ کا پرائم منسٹر ہاؤس شاہی محل سے کم نہیں ہے۔

(نوائے وقت)

ہم نے مغربی پاکستان کو ہی پورا پاکستان سمجھ لیا ہے

شہنشاہیت کے جبرو استبداد کے خلاف ایرانی عوام کی جدوجہد انسانی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے

ایسے بدکردار لوگ جنہیں موت کی سزا ملنی چاہئے' پاکستان میں حکمران اور خدا کے نائب بن بیٹھے ہیں!

جناب مختار مسعود کی شہرۂ آفاق کتاب "لوح ایام" پر ڈاکٹر احمد افضال کا تبصرہ

نام کتاب : "لوح ایام"
صفحات : 494
قیمت : 175 روپے
ناشر: العطاء 177 شادمان 2-لاہور

مختار مسعود کے تعارف کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ "آواز دوست" کے مصنف ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے اپنی انفرادیت اور ندرت کی بدولت اپنے خالق کو مشہور و معروف بھی بنا دیا ہے اور محترم و معتبر بھی۔ تاہم فی الحال ہمارا موضوع "آواز دوست" نہیں بلکہ اس کے مصنف کی تازہ تخلیق "لوح ایام" ہے۔

کتاب کا موضوع ۱۹۷۹ء کا انقلاب ایران ہے۔ اگرچہ مصنف نے اس انقلاب کی روداد لکھنے اور شائع کرنے میں ۱۷ برس صرف کر دیئے' لیکن یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ان ۱۷ برسوں میں ان کا موضوع ہرگز فرسودہ نہیں ہوا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انقلاب خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے' اس کی داستان ہمیشہ تازہ رہتی ہے' اس لئے کہ زمانہ صرف نام' مقام' اور وقت کے فرق کے ساتھ اس داستان کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔

ایرانی عوام کی شہنشاہیت کے جبرو استبداد کے خلاف جدوجہد انسانی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جس کے بھلائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں' یا ہوں گی' وہاں ایرانی عوام کی قربانیوں کو ہمیشہ ایک عظیم مثال اور قابل تقلید نمونے کی حیثیت حاصل رہے گی۔ بدقسمتی سے پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت کو ایرانی انقلاب کی غیر معمولی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوا ہے' اور اس عدم واقفیت یا تجاہل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس انقلاب کے برپا کرنے والے اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت کے [illegible] کا تعلق ایک ایسے مذہبی گروہ سے ہے جسے ہمارے ہاں بالعموم ہدایت یافتہ نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان حائل مغائرت کے پردے کا ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعتوں نے اپنے پڑوسی ملک میں واقع ہونے والی اس عظیم تبدیلی سے کوئی سبق نہیں سیکھا' اور یہ جماعتیں تاحال انقلابی راستے کو اختیار کرنے کی بجائے انتخابی سیاست کے خارزار میں الجھی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف انقلاب ایران کے فوراً بعد چند دانشوروں نے' جن میں سید اسعد گیلانی اور ڈاکٹر کلیم صدیقی سرفہرست ہیں' اس انقلاب کی شدت کے ساتھ حمایت شروع کر دی تھی' لیکن اس حمایت میں بھی افراط کا پہلو نمایاں تھا۔ ظاہر ہے کہ صدیوں سے موجود اعتقادی اور فقہی اختلافات کے بارے میں یہ گمان کر لینا صریحاً غلط ہو گا کہ وہ راتوں رات ختم کئے جا سکتے ہیں' نیز ایرانی انقلاب جن حالات میں برپا ہوا اور انقلابی حکومت نے مخالفین اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ جو معاملہ کیا' ان کی روشنی میں اس انقلاب کو ایک مثالی اسلامی انقلاب کا کامل نمونہ قرار دے دینا بھی درست نہ ہو گا۔ پھر انقلاب کے بعد ایران میں جس طرح علماء و فقہاء کے حق حکمرانی کو آئینی تحفظ دے کر ایک مذہبی طبقے کی حکومت (Theocracy) قائم کی گئی' اسے بھی اہل سنت کے نزدیک اسلام کے سیاسی نظام کی صحیح تعبیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک اس انقلاب کا قابل تقلید پہلو صرف اس کا وہ عوامی و احتجاجی انداز ہے جس کی بدولت یہ حقیقت مبرہن ہوئی کہ آج کے دور میں کسی بھی رائج الوقت نظام کو بدلنے کے لئے انتخابات یا مسلح جدوجہد کی بجائے ایک غیر مسلح مزاحمتی تحریک کا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

جناب مختار مسعود نے انقلاب اور اس کے بعد کا بحرانی دور تہران میں آر سی ڈی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے گزارا' اور اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گردوپیش کے حالات اور ان پر اپنے تأثرات کو یادداشتوں اور روزناموں کی صورت میں قلمبند کرتے رہے۔ ان یادداشتوں کی مدد سے لکھی جانے والی "لوح ایام" میں ادب اور زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے حالات و معاملات کا ذکر اور ایران سے ان کا موازنہ بھی شامل ہے' اور کہیں کہیں Flash back کے انداز میں مصنف کے اپنے ماضی کے تذکرے بھی ہیں۔ یہ سب باتیں انقلاب کی روداد میں طویل جملہ ہائے معترضہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں' لیکن کہیں بھی قاری کی دلچسپی کم نہیں ہونے پاتی۔ مجموعی طور پر مصنف کی شخصیت ایک محب وطن اور ملت کا درد رکھنے والے مخلص مسلمان کے طور پر سامنے آتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"اختیاری مضامین کی مختصر سی فہرست سنانے کے بعد کلاس ماسٹر نے ہر مضمون کے لئے باری باری ہماری رائے معلوم کی۔ جب فارسی کی باری آئی تو میں نے بڑے کیف و سرور کے ساتھ اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ عربی کی باری آئی اور میرے دل میں کسک اٹھی کہ میں ہاتھ اٹھانے والوں میں شامل نہیں ہوں۔ ماسٹر جواد کہتے ہیں کہ ایک شخص

بنگالی زبان محض اس لئے سیکھ رہا ہے کہ وہ ٹیگور کو پڑھ سکے۔ ادھر مسلمانوں کی اولاد کلام اللہ کی وارث ہونے کے باوجود عربی زبان سیکھنے سے جی چراتی ہے۔ یہ جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے اور نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ خوشی عارضی ہوتی ہے مگر کسک زندگی بھر ساتھ دیتی ہے۔ خواہشات کی فہرست طویل اور اس میں سے انتخاب کرنے کا حق محدود ہے۔ یہ زندگی نامکمل ہے۔ مکمل وہ ہوگی جس میں جو بھی جی میں آئے وہ پورا ہو جائے....." (صفحہ ۱۶)

سقوط ڈھاکہ کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس عظیم حادثہ کے باوجود جنرل یحییٰ خان بچے کھچے پاکستان کے صدر رہنے پر مصر تھے۔ ایک ریٹائرڈ جرنیل کا کہنا ہے کہ جب یحییٰ خان نے اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چند مشیروں سے مشورہ طلب کیا تو اس کی پرزور تائید کرنے والے دو سول افسروں کا تعلق محکمہ دفاع اور محکمہ اطلاعات سے تھا۔ ایک نے کہا عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ہم ٹی وی پر ایسے دلچسپ پروگرام دکھائیں گے کہ لوگ مشرقی پاکستان کو بھول جائیں گے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ اس فہم و فراست اور اپنی حالت پر رونا آتا ہے۔ خود فریبی اتنی کہ ہم نے مغربی پاکستان ہی کو پورا پاکستان سمجھ لیا ہے اور خود فراموشی ایسی کہ ہم نے مشرقی پاکستان کو یاد کرنا بھی چھوڑ دیا ہے"۔ (صفحہ ۵۵)

وطن عزیز میں جواب دہی کے فقدان کے متعلق لکھتے ہیں :

"نظریہ ضرورت کی سب سے بڑی خرابی یہ نہیں کہ اس کی مصلحتوں کے تحت ہر بار غیر قانونی عمل کو قانونی قرار دیا گیا' بلکہ یہ ہے کہ اس نظریہ نے ہم کو بے حس اور بے تعلق بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک میں لاچاری اور لاپروائی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہر قومی المیہ کو فوراً فراموش کر دینا ایک روایت بن گئی ہے۔ نہ کھلے دل سے جائزہ' نہ کھلے بندوں انکوائری۔ نہ عبرت ہے نہ ذوق۔ نہ سزا' نہ جزا۔ بس طاق نسیاں اور سرد خانہ۔ اس رویئے کا فائدہ صرف مجرموں کو پہنچتا ہے اور ایسے بدکردار لوگ جنہیں موت کی سزا ملنی چاہئے' مملکت خداداد پاکستان میں لوگوں کے حکمران اور خدا کے نائب بن بیٹھتے ہیں۔ ان سے کون حساب لے گا۔ خدا' عوام یا دونوں۔ اور کب لے گا۔ آج کل یا پرسوں۔ دنیا ہے تری منتظر روز مکافات"۔ (صفحہ ۳۲۳-۳۲۴)

ہر محب وطن شہری کی طرح فاضل مصنف کی بھی خواہش ہے کہ پاکستان میں عدل و احسان پر مبنی نظام قائم ہو۔ یہ خواہش اس پوری کتاب میں بین السطور چھپی ہوئی ہے' اگرچہ کہیں کہیں یہ بالکل واضح ہو کر بھی قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً

"آج تک پاکستان میں قوم اور ملک کے کسی مجرم کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی۔ وڈیرے ہی کیا کم تھے کہ لٹیرے بھی ان کے ساتھ اقتدار میں شامل ہو گئے ہیں۔ سمت بدلتی جا رہی ہے۔ جدھر منہ ہونا چاہئے ادھر پشت ہے۔ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں' جنہیں حل کیا جانا چاہئے انہیں ہوا دی جا رہی ہے۔ آگ لگی ہوئی ہے بجھانا کوئی نہیں۔ تاریخ سے جو عہد برعظیم کے مسلمانوں نے کیا تھا اسے حکومتیں توڑ رہی ہیں۔ نئی نسلیں اس عہد سے ناآشنا اور بے تعلق ہیں۔ محبتیں عنقا ہو گئی ہیں۔ حرام عام ہو گیا ہے۔ مسجد کی عمارت میں شگاف پڑ گیا ہے۔ زندگی کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ گدھ منڈیروں پر آن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اے پاکستانیو' تمہاری غیرت' جرات اور دور اندیشی کو کیا ہو گیا ہے۔ فرشتوں کا انتظار کر رہے ہو۔ جب تک تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو وہ نہیں آئیں گے۔ اٹھو' قربانی دو۔ وہ شہیدوں کے لہو کی خوشبو سونگھ کر آجائیں گے۔ یاد رہے کہ وہ خود نہیں آتے انہیں کوئی بھیجا کرتا ہے۔ تم اس کی اطاعت کرو' وہ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے' اب بھی ایسا ہو سکتا ہے..."

(صفحہ ۳۸۷)

مصنف کو اس حقیقت کا بھی پورا شعور ہے کہ پاکستان میں جاگیرداری کو "ام الخبائث" کی حیثیت حاصل ہے' اور یہی ہمارے اکثر مسائل کی اصل جڑ ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

"زہرا نگاہ ہماری ایک خوش خیال اور خوش آواز شاعرہ ہیں۔ ایرانی انقلاب پر جہاں اور بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں وہاں ایک نظم زہرا بہن نے بھی کہی ہے۔ ایران سے ہماری تاریخ' ثقافت' ادب اور معاشرہ نے جو کچھ مستعار لیا ہے اس کا احسان مندانہ ذکر کرتی ہیں۔ مشترک تہذیب کا حوالہ بڑی اپنائیت کے ساتھ دیتے ہوئے آخری دو مصرعوں میں ایک بڑی انوکھی بات کہتی ہیں۔ اگر ہے فرق کہیں پر تو بے ارادہ ہے۔ کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔ اے میرے نوجوان انقلابی ایرانی دوست' جب تک ہم اپنے فیوڈل نظام کے تحت قائم ہونے والی بادشاہتوں اور اپنی سیاست کی کج رفتاری کی وجہ سے ریاست کے اندر جو ریاستیں بن گئی ہیں انہیں ٹھکانے نہیں لگا لیتے اس وقت تک پاکستان کے دن کیسے پھر سکتے ہیں"۔ (صفحہ ۷-۴۸۶)

وطن عزیز میں اقامت دین کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعتوں کو انقلاب ایران پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود اس انقلاب کو آس پاس کے ممالک میں export کیوں نہیں کیا جا سکا؟ ہماری رائے میں اس کمی کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ایران میں انقلاب سے پہلے اسلام اور ایمان کی اعلیٰ ترین سطح پر تشکیل نو کا کام نہیں کیا جا سکا۔ اگرچہ مختلف افراد کے ذریعے نظریاتی سطح پر جو کام ایران میں ہوا وہ اپنی جگہ قابل قدر ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر علی شریعتی' جلال آل احمد' مرتضیٰ مطہری' سید محمد حسین طباطبائی' مہدی بازرگان' اور خود آیت اللہ خمینی کی تحریروں میں تعلیم یافتہ شیعہ نوجوانوں کے لئے بے انتہا کشش پائی جاتی ہے اور "لوح ایام" کے مصنف نے ان میں سے بعض کا تفصیلی تذکرہ کر کے پاکستانی قارئین سے ان کا تعارف بھی کرا دیا ہے۔ تاہم یہ کم و بیش اسی نوعیت کا کام ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' سید قطب شہید اور ان کے تلامذہ نے اسلام کے حرکی تصور کو عام کرنے اور اسلامی نظام حیات کے خدوخال کو واضح کرنے کے لئے انجام دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نوعیت کی تحریروں سے بے شمار مسلمان متاثر ہوئے ہیں' تاہم یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ موجودہ دور میں ایک حقیقی اسلامی انقلاب کے لئے سب سے پہلے ایک ایسی طاقتور علمی تحریک کو برپا کیا جانا لازم ہے جس میں پوری انسانیت کے لئے کشش اور تمام دنیا میں سرایت کر جانے کی قوت موجود ہو۔ بدقسمتی سے عالم اسلام کی اکثر احیائی تحریکوں نے اس بنیادی ذمہ داری کو ادا کئے بغیر سیاسی یا عسکری جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیا ہے' اور دوسری طرف جن افراد کو اس علمی و فکری انقلاب کی اہمیت کا اندازہ ہے وہ اس کے اصل مقصد یعنی اظہار دین حق یا اقامت دین کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں خاندان صفوی کی حکومت قائم ہونے کے بعد سے موجودہ دور تک ایران کا سرکاری مذہب ایک ہی رہا ہے' یعنی اثناء عشری شیعہ' اور علماء و فقہا کا ایک مضبوط اور موثر طبقہ بھی یہاں ہمیشہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

بقیہ : کتاب نامہ

موجود رہا ہے۔ اگرچہ رضا شاہ نے اپنے عہد میں (۱۹۲۶-۱۹۴۱ء) علماء کو کمزور اور غیر موثر بنانے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے' تاہم ۱۹۵۳ء کے بعد' جب سی آئی اے نے وزیر اعظم محمد مصدق کو ہٹا کر محمد رضا شاہ کو دوبارہ حکومت دلوائی تھی ایران میں امریکہ کے خلاف نفرت اور علماء کی حمایت اور طاقت میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے اواخر سے شہنشاہ کے خلاف جو عوامی احتجاجی تحریک شروع ہوئی اس میں اگرچہ لادینی' قوم پرست' اور خالص اشتراکی عناصر بھی شامل تھے' تاہم اس موقع پر ایران کے حلقہ علماء نے انتہائی منظم اور موثر ہونے کی وجہ سے بہت جلد تحریک کی قیادت سنبھال لی' یہاں تک کہ جب اوائل ۱۹۷۹ء میں شاہ کو تخت چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا پڑی تو حکومت مجاہدین خلق وغیرہ کے بجائے آیت اللہ خمینی کے حصے میں آئی۔ اس کے برعکس دوسرے مسلمان ملکوں میں یہ صورتحال موجود نہیں ہے' خصوصاً پاکستان میں اس کا کوئی امکان نہیں کہ کسی تحریک کے نتیجے میں حکومت کی باگ ڈور علماء کے ہاتھ میں آجائے۔ اس لئے کہ ایران کے برعکس' جہاں تمام علماء اثناء عشری شیعہ ہیں' ہمارے دینی و مذہبی عناصر کثیر تعداد میں فرقوں اور مسلکوں میں منقسم ہیں اور ان کی قوت باہم ایک دوسرے کے خلاف تو استعمال ہو سکتی ہے' اور ہوتی رہی ہے' لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ پاکستان کے سیاسی و معاشی نظام کو بدلنے میں کام آسکے۔ ان حالات میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بعینہ ایران جیسا انقلاب ہمارے ہاں نہیں آ سکتا' بلکہ یہاں ایک بالکل نئی تحریک کی ضرورت ہے جس کے کارکنوں کا جذبہ قربانی' سیرت و کردار' اور خصوصاً نظم کا معاملہ ہر لحاظ سے مثالی ہو۔ تاہم جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے' ایرانی انقلاب کی اصل رہنمائی یہ ہے کہ ایک غیر مسلح عوامی احتجاجی تحریک بھی نظام کو بدل سکتی ہے اور یہی حقیقت بعد کے سالوں میں فلپائن' سوویت یونین' اور مشرقی یورپ میں بھی ثابت ہو گئی۔ جناب مختار مسعود کی "لوح ایام" کا مطالعہ اس نوعیت کی تحریکوں کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

بقیہ : سیاست اور سیاست دان

یہ بات اور بھی عجیب ہے کہ ان کی پارٹی میں شامل ہونے والے بیشتر افراد منزل مراد سے ہمکنار ہو چکے ہیں' گوہر ایوب خان قومی اسمبلی کے سپیکر رہ چکے ہیں۔ ان دنوں وہ حزب اختلاف کے ڈپٹی لیڈر ہیں' سردار اکبر بگٹی' ارباب جہانگیر خان اور عبداللہ شاہ اپنے اپنے صوبوں میں وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں یا اب بھی فائز ہیں۔ میاں نواز شریف پنجاب کے وزیر خزانہ سے ترقی کر کے ملک کے وزیر اعظم کے عہدے تک جا پہنچے غالباً جنرل ضیاء الحق کی پیروی کرتے ہوئے' وزارت عظمیٰ کے آخری دنوں میں شاید ان کے اندر چھپی ہوئی تحریک استقلال نے سر اٹھایا اور وہ پارلیمنٹ' فوج' صدر اور بعد ازاں عدالت عظمیٰ کی تائید و حمایت حاصل ہونے کے بعد ایوان اقتدار سے باہر نکال دیئے گئے۔ اب میاں صاحب ایک بار پھر حزب اختلاف کی کوچہ گردی کر رہے ہیں' ایئر مارشل کے متعدد ساتھی بھی ان کے ہمراہ ہیں اور ایئر مارشل تحریک استقلال کی قیادت کا خاردار تاج ملک حامد سرفراز کے زیب کر کے خود بھی ایوان صدر کی بھولی ہوئی راہ تلاش کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس راہ پر چلتے ہوئے ایوان صدر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے یا امریکہ وقت پر کسی "اور" کو سامنے لے آئے گا اور "مسٹر کلین" پھر کلین بولڈ ہو جائیں گے؟۔ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

بقیہ : نامے میرے نام

بند کر کے ان کی جگہ اصلاحی اور معلوماتی پروگرام پیش کئے جائیں تاکہ ہماری نئی نسل ایک اچھے مسلمان کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو اور اچھے شہری ثابت ہوں۔

نگران نشر و اشاعت
ثمینہ اسلم
(جامعہ فاروقیہ ڈسکہ)

بقیہ : خطبات خلافت

ایودھیا کی مسجد کی تہدیم پر پورے عالم اسلام میں ان دو ممالک --- پاکستان اور بنگلہ دیش --- کے علاوہ کہیں ردعمل نہیں ہوا۔ کسی مسلمان ملک نے یہ تک نہیں کہا کہ مسجد دوبارہ تعمیر کرو ورنہ ہمارے تمہارے ساتھ تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ سفارتی تعلقات توڑنا تو دور کی بات ہے' اگر صرف امارات' سعودی عرب اور کویت کی یہ دھمکی آجاتی کہ ہم تجارتی تعلق منقطع کر رہے ہیں تو بھارت کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔

یہ ہے تیسری صورت جو بدترین ہوگی۔

بقیہ : حدیث امروز

کے شکوے کے بارے میں اتنا ہی عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ وہ قرض دینا مدد تصور کرتے ہیں' ہم قرض مانگنے پہ نازاں ہیں۔ وہ قرض دے کر اس کے صحیح استعمال پر توجہ دیتے ہیں' ہم قرض لے کر گل چھرے اڑانے کے عادی بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا چنگی بھرنا ہمیں پسند نہیں آتا۔ اقوام عالم میں جذبہ حریت اس عروج کو پہنچ پایا ہے کہ اب کسی پر جارحانہ یلغار ممکن نہیں' البتہ کامیاب معاشرہ بلا سوچے سمجھے از خود کمزور معاشرے پر حاوی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دین برحق ہے۔ یہی بہترین طرز حیات ہے۔ غیروں کے خلاف رونا رونے کے بجائے اپنے ہاں اسے تمام عیاریوں سے بالاتر ہو کر عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کریں' معاشرہ برائی کے خلاف از خود ڈھال بن جائے گا۔ چونکہ ہم نے بہترین امت ہونے کے اعزاز کی لاج نہ رکھی اور قیادت کا دیا مقام عروج کھو کر پستی اختیار کرتے چلے گئے لہٰذا شیطانی سیلاب کا نشیبی علاقے میں داخل ہو جانا کوئی عجوبہ نہیں۔ اپنا مقام بحال کیجئے' سیلابی پانی لوٹ جائے گا۔OO

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب

کے دروس اب بزبان انگریزی بھی دستیاب ہیں۔ جولائی 94ء میں نیو جرسی (امریکہ) میں منعقدہ قرآنی کیمپ میں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

کے دروس کا یہ سیٹ 32 ویڈیو کیسٹ پر مشتمل ہے۔

برائے رابطہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون : 5869501-2

ہڑتال والے دن ویڈیو شاپس والوں کی چاندی ہوتی ہے

ہمارا اصل مرض یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے تیار نہیں!

ایم کیو ایم مہاجر صوبے کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتی کہ اس سے اندرون سندھ مہاجروں کا قتل عام ہو گا

م۔ س

معلوم ہوا کہ آج صبح صبح چند بندوق بردار لڑکے مارکیٹ میں آئے تھے اور وہ دوکانیں بند کرا گئے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اب اس شہر کا یہ حال ہو گیا ہے کہ دو چار لڑکے اسلحہ دکھا کر دوکانیں بند کرا دیتے ہیں اور ان سے کوئی یہ پوچھنے کی جراءت نہیں کرتا کہ آپ ہیں کون؟ خوف و دہشت کا یہ عالم ہے کہ کسی دوکاندار کو جراءت نہیں ہوتی کہ بعد میں بھی اپنی دوکان کے شٹر کھول سکے۔

گزشتہ دو دنوں کے اخبارات سے جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایم کیو ایم حقیقی والوں کا نشتر پارک میں ۱۹/جولائی کو جلسہ منعقد ہوا جس میں انہوں نے جنوبی سندھ صوبہ کے قیام کا مطالبہ کیا اور یہ عزم ظاہر کیا ہے کہ یکم اگست سے اس سلسلے میں دستخطی مہم شروع کریں گے۔ ایم کیو ایم (جسے حکومت الطاف گروپ سے موسوم کرتی ہے) کی رابطہ کمیٹی نے ایم کیو ایم حقیقی کی اس تازہ مہم کو حکومت سندھ کی جانب سے ایک سازش قرار دیا اور کہا کہ اس کے ذریعے ایک جانب حکومت آفاق احمد کو جو ایم کیو ایم حقیقی کے چیئرمین ہیں' ہیرو بنانا چاہتی ہے اور دوسری جانب وہ جنوبی سندھ صوبہ کو سندھ کارڈ کے طور پر پنجاب کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے۔ واضح رہے کہ ایم کیو ایم اب تک مہاجر صوبہ کے مطالبے سے اپنے آپ کو لاتعلق ظاہر کرتی رہی ہے گو کہ اس نے اس سلسلے میں بقول ان کے مہاجر عوام سے رائے لینی شروع کر دی ہے۔ باخبر حلقے یہ کہتے ہیں کہ ایم کیو ایم واضح طور پر مہاجر صوبہ کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتی کہ اسے خدشہ ہے کہ اس کے اس اعلان سے اندرون سندھ بسنے والے مہاجروں کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حکومت ایم کیو ایم حقیقی کے ذریعے مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان تصادم کروانا چاہتی ہے۔

جس زمانے میں ایم کیو ایم کا قیام عمل میں آیا تھا اسی زمانے میں غلام سرور اعوان نے پی پی آئی یعنی پنجابی پختون اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی جانب سے بھی دو جلسوں کا اعلان کیا گیا ہے۔ ایک نشتر پارک میں جہاں ایم کیو ایم حقیقی نے جلسہ کیا ہے (نشتر پارک سیاسی جلسوں کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کہ ڈھاکہ میں پلٹن میدان کو حاصل تھی) دوسرا جلسہ انہوں نے باچا خان چوک پر رکھا ہے جو پٹھان کالونی سے ملحق ہے۔ ایک تیسری سیاسی شخصیت بھی حال ہی میں ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے جو ظفر جھنڈیر کے نام سے پہچانی جاتی ہے یہ شخص سندھ اتحاد نامی تنظیم کے چیئرمین ہیں۔ اس تنظیم نے حال ہی میں ایک ہڑتال کے دن جو ایم کیو ایم کی کال پر ہوئی تھی' ایم کیو ایم کے ہیڈ کوارٹر نائن زیرو پر دھاوا بولا تھا اور آئے دن کی ہڑتالوں کے خلاف ردعمل کے طور پر وہاں توڑ پھوڑ کی تھی۔ ظفر جھنڈیر نے ۲۰/جولائی کو جنوبی سندھ صوبہ کے مطالبہ کے خلاف ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ سندھی قوم پرستوں کے متحدہ محاذ نے بھی جنوبی سندھ صوبہ کو حکومت کی سازش قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ حکومت ایم کیو ایم کے ان اسیر رہنماؤں کو رہا کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی جن کے خلاف قصاص ودیت کے مقدمات درج ہیں۔ ٹرانسپورٹروں نے ۲۱/جولائی کو کامیاب ملک گیر پہیہ جام ہڑتال کی۔ ایم کیو ایم اور اس کی حالیہ نو اتحادی جماعتوں نے بھی اسی روز پورے سندھ میں عام ہڑتال کرائی۔ ایم کیو ایم ہو یا ایم کیو ایم حقیقی' پی پی آئی ہو یا سندھ اتحاد ان تمام تنظیموں کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ ان کے قیام و بقا میں ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے کراچی کی تازہ ترین صورتحال سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نادیدہ ہاتھ پھر اسے کسی نئے بحران سے دوچار نہ کر دے۔ کراچی وہ بدنصیب شہر ہے جس کے شہری گزشتہ دس برسوں سے بے پناہ مصائب برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ چند ہفتوں سے صورتحال کچھ بہتر نظر آنے لگی تھی اور حکومتی حلقے بھی دعویٰ کر رہے تھے کہ کراچی میں امن و امان قائم ہو چکا ہے لیکن شاید اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ عشرے میں اس شہر کے باشندوں پر وہ کچھ گزر چکا ہے جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہاں کے شب و روز بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور سرکشی سے ہم باز آنے والے نہیں۔ ہڑتال والے دن ویڈیو شاپس والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ڈش انٹینے اب شہر کی ان مضافاتی بستیوں میں بھی نظر آنے لگے ہیں جو مزدوروں کی آبادیوں کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ مزدور جو بارہ بارہ گھنٹے کام کرنے کے باوجود بدحالی کا شکار ہے اور زیادہ سے زیادہ اوور ٹائم کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے' جب اس کا یہ حال ہے تو پھر ڈیفنس اور کلفٹن کے "طبقہ مترفین" کا حال کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ کیا مومنوں کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر سے لرز اٹھیں۔ سیاسی راہنماؤں سے تو ہمیں یہ توقع نہیں کہ وہ لوگوں توبہ کی تلقین کریں گے چاہے وہ اہل اقتدار ہوں چاہے اپوزیشن میں چاہے وہ سیکولر ذہن کے حامل ہوں چاہے مذہبی سیاسی جماعتوں سے ان کا تعلق ہو۔ لہٰذا اب تو ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ "مردے از غیب بروں آید" والا معاملہ ہو جائے تو ہو۔ کاش ایسا ہی ہو جائے۔OO

☆☆

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

افکار معاصر

یہ ملک مٹھی بھر مفاد پرستوں کی عیاشیوں کے لئے نہیں بنا تھا

عدلیہ نے آزمائشوں اور مشکلات کے باوجود اپنی حیثیت دھڑلے سے منوالی ہے

ناکارہ مقنّنہ اور شرم سے عاری انتظامیہ نے ہمیں پستی کی انتہا تک پہنچادیا ہے

اردشیر کاؤس جی اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

گلاس ٹاور کا معاملہ تیسری دنیا کے ایک کرپٹ ممالک کے "کارناموں" کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مین کلفٹن روڈ پر زیر تعمیر اس عمارت سے میری دلچسپی میرے ایک کالم سے شروع ہوئی جو میں نے اپریل میں لکھا تھا۔ اس منصوبے کو ہمارے وزیر اعلیٰ سید عبداللہ شاہ کی اشیرواد حاصل تھی جنہوں نے تمام قواعد و ضوابط کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ ۱۹ منزلہ عمارت تعمیر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی حالانکہ اس علاقے میں تہ خانہ سمیت ۵ منزلوں سے اوپر کوئی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح پلاٹ کی نسبت ۳ : ۱ سے بڑھا کر ۸ : ۱ کر دی گئی۔ تکمیل کار (developer) نے خود تسلیم کیا کہ اسے غیر قانونی کام کرانے کے لئے خاصی بڑی رقم دینی پڑی۔

وزیر اعلیٰ صاحب کو اپنی غلطی کا احساس کرنے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ تب انہوں نے اس پر جیسا کہ ہمارے ہاں معمول ہے واویلا شروع کیا اور خود اپنے جاری کئے ہوئے احکامات کی تفتیش کمشنر ضیاء الاسلام کے سپرد کر دی۔ ساتھ ہی ڈپٹی کمشنر (جنوبی) عارف الٰہی کو تعمیر کا کام روک دینے کا حکم صادر کر دیا۔ چند روز بعد کے۔ ڈی۔ اے کے ڈائریکٹر جنرل احمد حسین نے پریس کے لئے ایک بیان جاری کیا کہ تعمیر کا کام منظور شدہ نقشوں کے مطابق ہو رہا ہے لیکن یہ بات گول کر گئے کہ نقشوں کی منظوری خلاف ضابطہ ہوئی تھی۔ کمشنر نے اپنی تفتیش کے بارے میں کچھ بتانے سے معذری ظاہر کی اور لکھا کہ "انکوائری رپورٹ ایک سرکاری دستاویز ہے جو وزیر اعلیٰ کو بھیج دی گئی ہے لہٰذا صرف وہی اس کو عام کر سکتے ہیں اگر ایسا کرنا عوام کے وسیع تر مفاد میں ہوا"۔ وزیر اعلیٰ نے اس رپورٹ کو عوام کے وسیع تر یا کم تر مفاد میں شائع کرنا ضروری نہ سمجھا۔

رہائشی بلڈنگ جس پر گلاس ٹاور کی تعمیر ہو رہی ہے پاکستان ٹوبیکو کمپنی کی ملکیت تھا اور اس پر کمپنی کے افسروں کے لئے ایک رہائشی عمارت کھڑی ہے۔ پلاٹ کو تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے اور اس پر گلاس ٹاور کی تعمیر کے نقشوں کی منظوری کے لئے درخواست میں غلط طور پر پی۔ ٹی۔ سی کو اس کا مالک ظاہر کیا گیا اور متعلقہ حکام نے بلا چون و چرا کئے تعمیل کر دی۔

جب وزیر اعلیٰ اور ان کے چیلے چانٹوں کی طرف سے ہمیں کورا جواب مل گیا تو قانون پسند شہریوں کے ایک گروہ نے میرا ساتھ دیا چنانچہ ہم نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا فیصلہ کیا۔ ایک غیر سرکاری تنظیم "شہری" کے علاوہ تیرہ اشخاص مدعی ہیں جن میں جناب مہر علوی، آسکر ڈی فریٹس، احمد ابراہیم، ناظم حاجی، حمید میکر، محمد فتح علی، آرکیٹیکٹس حسنین لوٹیا، حبیب فدا علی، عارف حسن، ارشد عبداللہ اور انجینئر رولنڈ ڈی سوزا شامل ہیں۔

ہم نے بیرسٹر محمد گلبرٹ نعیم الرحمٰن کے ذریعے ۵ اگست کو سندھ ہائیکورٹ میں پٹیشن نمبر ڈی۔ ۱۲۸۰/۹۶ دائر کر دی جو خوش قسمتی سے ۶ اگست کو جسٹس وجیہہ الدین احمد اور جسٹس حامد علی مرزا پر مشتمل ایک مضبوط بنچ کے سامنے سماعت کے لئے پیش ہوئی۔ انہوں نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے پیٹیشن کو جائز قرار دے دیا اور مختلف مدعا علیہان سرکاری محکمہ جات اور تعمیر کنندگان کو نوٹس جاری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ سندھ ہائیکورٹ کے ناظر کو کمشنر مقرر کر کے ہدایت کی گئی کہ موقع ملاحظہ کر کے دس روز کے اندر رپورٹ پیش کرے، جیسا کہ استدعا کی گئی تھی اگلی سماعت تک عدالت نے گلاس ٹاور کی تعمیر کا کام روک دیا ہے۔

ہم نے بحیثیت قوم کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند کئے رکھیں جس کی وجہ سے ہمارے لیڈروں کو اودھم مچانے کا موقعہ مل گیا۔ یہ رونے دھونے کا موقعہ نہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان راہنماؤں کو بتائیں کہ ہم بھی انسان ہیں۔ بہت ہو چکا، تیرہ کروڑ عوام کو اپنے حقوق کے لئے جابر حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا ہو گا۔ یہ ملک لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کے لئے نہیں بنا تھا۔ یہ ملک مٹھی بھر مفاد پرستوں کی عیاشیوں کے لئے نہیں بنا تھا۔ اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو یہاں کچھ باقی نہیں بچے گا۔

پہلے دو حکومتی ستون، ناکارہ قانون ساز اور شرم سے عاری انتظامیہ نے ہمیں پستی سے بھی آگے پہنچا دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تیسرے ستون، یعنی عدلیہ نے آزمائشوں اور مشکلات کے باوجود اپنی حیثیت دھڑلے سے منوالی ہے اور ہمارا سہارا بن رہی ہے۔

پاکستان کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے داماد، انجینئر پرویز علی شاہ کو جن کے گھر پر دھاوا بولا گیا تھا اور جنہیں سندھ حکومت کی طرف سے لگائے گئے الزامات کے تحت معطل کر دیا گیا تھا، حال ہی میں دوبارہ ملازمت پر بحال کر دیا گیا ہے۔ کیا یہ انتظامیہ کی ذمہ داری نہیں کہ عجلت میں کی گئی انتقامی کارروائی اور جھوٹے الزامات کی چیف جسٹس سے معافی مانگے؟

(بشکریہ : ڈان)